مفتی محمد عبدہ

(حالاتِ زندگی)

مترجمہ

محمد مظہر الدین صدیقی بی۔اے

شائع کردہ

دفتر اقبال اکیڈمی۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

(قیمت بارہ ۱۲ آنے)

عبدہٗ محمدؐ

سید محمد شاہ ایم۔ اے پرنٹر و پبلشر کے اہتمام سے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں
طبع ہو کر دفتر رسالہ پیغام حق ظفر منزل تاجپورہ۔ لاہور سے شائع ہوئی

دیباچہ

اس زمانہ میں مصر بہ نسبت ہندوستان کے بہت زیادہ آگے ہے۔ مگر ابھی بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ یہ دونوں ملک ہر لحاظ سے تقریباً بالکل ایک جیسے تھے۔ اس دوران میں اگر ہندوستان نے کچھ بھی ترقی کی ہے تو اُس سے محض ہندو کو فائدہ پہنچا ہے مسلمان تو پہلے سے بھی زیادہ گیا گزرا ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی روشنی جس قدر پھیل رہی ہے مسلمانوں کے دل و دماغ اسی قدر تاریک ہو رہے ہیں۔ کیونکہ تہذیبِ مغرب اور تہذیبِ اسلام دو متضاد چیزیں ہیں۔ اگر مسلمانوں نے اُن اصولوں کو تسلیم کر لیا اور اُن خیالات پر چل نکلے جو اس وقت مغرب کی تہذیب و تمدن کے ستون ہیں تو ظاہر ہے کہ اُن کا اپنا قصرِ رفیع ویرانہ بن کر رہ جائے گا۔

مفتی محمد عبدہ مصری نے ایسے ہی حالات میں اہل مصر کی رہنمائی کی۔ اُن کو الحاد و بے دینی کی بڑھتی ہوئی رَو سے بچایا۔ صدیوں کے جمود و غفلت سے بیدار کیا اور اُنہیں مسلمان رکھتے ہوئے ہر معاملہ میں ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ یہ کتاب اسی اجمال کی مختصر مگر دل نشین تفصیل ہے۔

محمد شاہ

مقدمہ

مضمون زیرِ نظر چارلس ایڈمس (CHARLESADAMS) کی کتاب (ISLAM AND MODERNISM IN EGYPT) کے بعض ابواب کا ترجمہ ہے جو مفتی محمد عبدہٗ کی سرگذشت حیات سے متعلق ہیں مصنف ایک عیسائی مشنری ہے جس نے مصر میں رہ کر وہاں کی اصلاحی تحریکوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے عیسائی ہونے کے باوجود اُس نے نہایت بے تعصبی اور کامل غیر جانبداری سے محمد عبدہ کے حالاتِ زندگی اپنی کتاب میں پیش کیے ہیں۔

محمد عبدہ کی زندگی کے اس مختصر مرقع میں انیسویں صدی کے اواخر کی مصری سیاست کا پورا پورا عکس موجود ہے جس سے ہمیں بہت کچھ سبق حاصل ہو سکتا ہے۔ گذشتہ صدی کا نصف آخر دورِ عالم اسلامی کا انتہائی دورِ تنزل تھا۔ اسی زمانہ میں اسلامی حکومتوں کے اقتدار و تسلط کو اتنا سخت دھکا لگا کہ یا تو وہ بالکل ناپید ہو گئیں یا اگر باقی بھی رہیں تو مغربی استعماریت کے استیلاء نے انہیں بالکل بے دست و پا کر دیا۔ مرکزی اقتدار کے کمزور ہوتے ہی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں انتشار و اضمحلال کے آثار نمایاں ہونے لگے اور مسلمانوں کے دلوں پر حزن و یاس شکست خوردگی اور بے مائیگی کا احساس چھا گیا لیکن اسی دور میں بعض ایسی عملی شخصیتیں بھی منظرِ عام پر آئیں جنہوں نے مسلمانوں میں قومی عزت و خودداری کا احساس پھر جگانا چاہا اور بیشمار مخالفتوں کے باوجود اپنے نصب العین کی تکمیل میں ثابت قدمی کے ساتھ سرگرم کار رہے۔ ہندوستان میں سر سید احمد مرحوم مصر میں مفتی محمد عبدہٗ اور کل عالم اسلام میں سید جمال الدین افغانی اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے ان قوتوں اور اجتماعی محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی جو زمانہ جدید کی تشکیل میں حصہ لے رہے تھے اور مغربی تمدن کے استیلاء کا باعث ہوئے تھے۔

محمد عبدہ اور سرسید احمد خان کی زندگی میں ایک عجیب و غریب مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کی زندگی کا بیشتر حصہ تعلیم کی اصلاح و اشاعت میں صرف ہوا۔

محمد عبدہ نے جامعہ ازہر کے طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم کی اصلاح پر اپنی مساعی مرکوز کیں۔ سرسید احمد خان نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ دونوں نے اپنی اپنی زبانوں میں ایک ادبی انقلاب کی ابتدا کی۔ عیسائی مورخین اور اہل علم اسلام کے خلاف جو زہر افشانی کر رہے تھے اور جس طرح اسلام کو دوسروں کی نظروں میں ذلیل و خوار کر رہے تھے دونوں اپنے اپنے حدود میں اس کے دفعیہ کے لئے کوشاں رہے۔ دونوں کو علمائے کرام کی ملامت کا نشانہ بننا پڑا اور اس کی وجہ سے جمہور مسلمین کی مخالفت برداشت کرنا پڑی۔ اور یہی ان کی زندگی کا سب سے زیادہ المناک واقعہ ہے انہوں نے جو کچھ کیا وہ اسلام اور مسلمانوں کی عزت و وقار کے قیام کے لئے کیا لیکن اس کے جواب میں انہیں علمائے وقت کی منظم مخالفت کا پھل ملا۔ یہ مخالفت اگر اصولی ہوتی تو کوئی ہرج نہ تھا لیکن علمائے کرام کے اختلاف نے سب وشتم بغض وعداوت اور لعن طعن کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے جس راہ کو اختیار کیا تھا استقلال کے ساتھ اس پہ گامزن رہے یہاں تک کہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ صرف محمد عبدہ اور سرسید ہی نہیں بلکہ اسلامی حکومتوں کے زوال کے بعد جو شخص بھی کوئی اجتماعی تحریک لے کر اٹھا اس کو علمائے وقت نے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ علماء کے اس طرز عمل کی توجیہہ کیونکر کی جا سکتی ہے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گذشتہ دو صدیوں سے ہمارے علماء کا طبقہ زمانہ کی نت نئی ضروریات سے غافل اور مغرب کی ذہنی ترقی سے بے خبر ایک ایسے خیالی عالم میں زندگی گزار رہا تھا جس کو حقیقی دنیا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ادھر تو انقلابات کا سمندر موجیں مار رہا تھا اور مغربیت کے طوفان میں اسلام کی کشتی ڈگمگا رہی تھی۔ اُدھر یہ جماعت غفلت کے قلعوں میں محصور جزوی اور فرعی مسائل میں اتنی منہمک تھی کہ اُس کو آنے والے طوفان کا علم تک نہ تھا اگر اس طبقہ میں اتنی اہلیت ہوتی کہ وہ ان

انقلابات کی نوعیت کا کوئی صحیح اندازہ قائم کر سکتی اور اسلام پر جس رخ اور جن ہتھیاروں سے حملے کئے
جا رہے تھے اُن سے اپنے تئیں باخبر رکھتی تو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اور اسلامی فکر و نظر کو وہ شدید
نقصان نہ اٹھانا پڑتا جس کی تلافی اب مشکل معلوم ہوتی ہے۔ مگر تقلید روایت پرستی اور شخصی عظمت سے
مرعوبیت علماء کے دل و دماغ کو اتنا متاثر کر چکی تھی کہ اُن میں رہنمائی کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہ گئی
تھی۔ اگر معاملہ بس اسی حد تک ہوتا تو کوئی مشکل نہ پڑتی۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان تمام خرابیوں کے
باوجود جمہور اسلام کو علماء سے بے حساب عقیدت تھی۔ عام مسلمان صرف ان کی ظاہری وضع قطع سطحی
مذہبیت اور تقلیدی علم و فضل کے پرستار تھے انہوں نے اس پر کبھی نہیں غور کیا کہ انفرادی علوئے اخلاق
اور شخصی مذہبیت اور چیز ہے اور جماعت کی رہنمائی اور اُمت کی قیادت کچھ اور ہی شے ہے۔ اس کے لئے صرف
اخلاقی فضیلت اور روحانی بلند پائیگی کافی نہیں ہے بلکہ وسیع علم چاہئے وقت و زمانہ کے مطالبات اور ماحول
کے تغیرات کی سمجھ بوجھ چاہئے اور اصول و فروع کے امتیاز کی اہلیت چاہئے۔

علماء کی یہ حالت آج تک اسی طرح قائم ہے لیکن اب اس میں ایک اور چیز کا اضافہ ہو گیا ہے وہ یہ
کہ اس طبقہ کی اخلاقی سطح روز بروز پست ہوتی جا رہی ہے اسلام اور اسلام کے انفرادی اور اجتماعی نصب العین سے
زیادہ ہمارے علماء کو اب اپنے طبقہ کا اقتدار اپنی جماعت کا تسلط اور اپنا مرتبہ و وقار عزیز ہے اس کا ثبوت چاہیے تو ہمارے
علماء کے سیاسی مسلک پر غور کر لیجیے۔ آج متحدہ قومی حکومت کے مقابلہ میں اسلامی حکومت کے تخیل کا سب سے بڑا دشمن
کون ہے مسلمانوں کی انفرادیت اور ان کے جداگانہ قومی تشخص سے آج سب سے زیادہ مخالفت کس کو ہے اسلامی تمدن کے
وجود سے انکار کرنے والوں منظم مذہب (ORGANISED RELIGION) کے مخالفین سے کفر اسلام کے امتیاز پر طعنہ زنی
کرنے والوں سے اور مذہب کو صرف ایک شخصی عقیدہ اور چند مخصوص مراسم و عبادات کے مجموعہ کی حیثیت دینے
والوں سے آج کونسی جماعت تعاون میں سبقت لے جانے کے لئے کوشاں ہے اس تعاون علی الاثم والعدوان کے نظارے
کو دیکھیے اور آپ خود ہی سمجھ لیں گے کہ سر سید احمد خان، مفتی محمد عبدہ اور علامہ جمال الدین افغانی کی کوششوں سے

علمائے اسلام کو کیوں مخالفت تھی۔ اگر جمہور اسلام تک مذہب اپنی حقیقی شکل و صورت میں پہنچ جائے اگر ان کی جہالت دور ہو جائے اگر مذہب میں اجتہاد کا دروازہ کھول دیا جائے۔ اگر شخصیت پرستی کا بتکدہ ویران ہو جائے تو چند قابل احترام ہستیوں کو چھوڑ کر موجودہ علمائے اسلام کو عزت و وقعت کی نظروں سے کون دیکھے گا مغربی تسلط کو اتنا عرصہ گذر چکا ہے اور آج تک علماء کو مغرب کی اُن علمی اور عقلی تحریکات کا کوئی تفصیلی علم نہیں ہے جو اسلامی عقائد و افکار کی بنیادوں کو متزلزل کر رہی ہیں ایران اور ترکی کے سارے انقلابات آئے اور ان کے سر پر گزر گئے لیکن آج تک انہوں نے ہم کو یہ نہیں بتایا کہ موجودہ زمانے میں اگر ایک حقیقی اسلامی حکومت قائم کرنا ممکن ہو تو اس کا معاشی نظام کیا ہوگا اسلام کے معاشرتی اور عمرانی قوانین اس میں کس طرح نافذ کیے جائیں گے اور موجودہ مادّی دنیا میں جہاں معاشی اغراض حکومتوں اور مملکتوں کی پالیسی کا محور ہیں اس اسلامی حکومت کی خارجی پالیسی کس طرح سے طے پائے گی۔

محمد عبدہ کی زندگی سے سب سے بڑا درس جو ہم کو مل سکتا ہے وہ یہی ہے کہ ہماری دینی اور دنیوی اصلاح میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے علماء کی پستی اور کم نظری ہے اصلاح کی کوئی تحریک جب اور جہاں کہیں اٹھی علماء کی مخالفتوں کا شکار ہو گئی اس صورت حال کو ختم کرنے کے صرف دو طریقے ہو سکتے ہیں یا تو علماء کے طبقہ میں چند ایسے افراد پیدا ہو جائیں جو اپنی جماعت کو زمانے کی ضروریات اور حقیقی زندگی کے مسائل کی طرف متوجہ کریں اس کے اخلاقی تنزل کو دور کریں اور اس میں سے برہمنیت کا استیصال کریں یا پھر کمال اتاترک کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اس طبقہ کے اقتدار کو بالکل مٹا دیا جائے۔

یکم اکتوبر ۱۹۴۰ء

محمد مظہر الدین صدیقی
حیدرآباد دکن
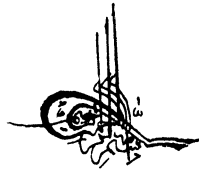
محمد عبدہ

ابتدائی زندگی

(۱۸۴۹ء سے ۱۸۷۶ء تک)

پیدائش اور ابتدائی زمانہ محمد عبدہ کی صحیح جائے پیدائش نامعلوم ہے اور نہ ان کی تاریخ پیدائش کا تعیین ہو سکا ہے۔ عام طور سے ۱۸۴۹ء ان کا سال پیدائش مانا جاتا ہے اور خود ان کی تحریروں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اگرچہ بعض لوگ ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۴۲ء بتلاتے ہیں۔ محمد علی پاشا کے عہد حکومت کے اواخر میں محمد عبدہ کے والد نے حکام صوبہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر ترک وطن کیا اور صوبہ غربیہ میں آ کر مختلف قریوں میں سکونت اختیار کی۔ اسی آوارہ وطنی کے زمانہ میں انہوں نے شادی کی اور محمد عبدہ پیدا ہوئے۔ اس کے چند سال بعد ان کے والد اپنے اہل و عیال کے ساتھ محلات نصر واپس آئے

جہاں انہوں نے تھوڑی زمین حاصل کرلی۔

یہاں محمد عبدہ کی تعلیم و تربیت بالکل اسی طرز پر ہوئی جو اس زمانہ کے مصری قریوں میں رائج تھا۔ اُن کی جسمانی نشوونما اچھی ہوئی اور انہوں نے تیراکی، گھوڑے کی سواری اور نشانہ بازی میں بڑی مہارت حاصل کرلی۔ اسی زمانہ سے انہیں بیرون خانہ زندگی گزارنے کا شوق پیدا ہوا جو آخر عمر تک باقی رہا۔ ان کی شخصیت کے بعض نمایاں اوصاف جو آئندہ زندگی میں ظاہر ہوئے درحقیقت عکس تھے دیہاتی رسم و رواج اور قبائلی زندگی کی ان خصوصیات کا جن میں ان کی ابتدائی عمر گزری تھی۔ عوام کی ضروریات کا احساس ان ضروریات کی تکمیل کے لیے مخلصانہ سعی و عمل اور قومی زندگی کی اصلاح کا ولولہ یہ سب صفات اسی دیہاتی ماحول کے پیدا کیے ہوئے تھے جہاں وہ اپنے بزرگوں سے محمد علی پاشا کے عہد حکومت کے افسانے سُنا کرتے تھے جو اُس زمانہ تک لوگوں کی یاد میں تازہ تھے۔

ان کے والدین اگرچہ تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن سیرت کی پختگی اور کردار کی بلندی ان میں ضرور تھی۔ اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں محمد عبدہ اپنے باپ کا نام بڑی عزت سے لیتے ہیں اور ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہم وطن ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ اِس زمانہ میں محمد عبدہ کے والد نسبتاً فارغ البالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے اور انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے لیے جس کو وہ عمدہ تعلیم دلانے کے آرزومند تھے ایک استاد مقرر کر دیا تھا جو گھر پر محمد عبدہ کو لکھنا پڑھنا سکھاتا تھا۔ محمد عبدہ کے والد کی حالت دیہات کے اور باشندوں سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی بجز اس کے کہ ان کے پاس کچھ زمین تھی۔

دس سال کی عمر میں جب محمد عبدہ لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے انہیں ایک حافظ صاحب کے سپرد کیا گیا تاکہ وہ انہیں قرآن مجید حفظ کرائیں یہی ایک تعلیم تھی جو اُس زمانہ میں غریب غربا کے لڑکوں کے لیے ممکن تھی جدید تعلیم دینے والے مدارس کی تعداد بہت محدود تھی اور

ان میں بھی صرف سرکاری عہدہ داروں کے لڑکے شریک ہو سکتے تھے۔

ان بنیادوں پر تعلیم پا چکنے کے بعد نوجوان محمد عبدہ کو تیرہ سال کی عمر میں طنطہ کی احمدی مسجد کے مدرسہ میں حفظ قرآن کی تکمیل اور قرأت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے شریک کر دیا گیا محمد عبدہ کے ایک رشتہ دار اس مدرسہ میں معلّم تھے اور بحیثیت قاری تھوڑی بہت شہرت بھی رکھتے تھے۔ دو سال تعلیم پانے کے بعد محمد عبدہ کو عربی صرف و نحو کی ابتداء کرائی گئی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اس صبر آزما مشقت کو برداشت نہ کر سکے۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں وہ لکھتے ہیں "میں نے تقریباً ڈیڑھ سال تک صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی لیکن اس مضمون کا ایک لفظ بھی میں نہ سمجھ سکا کیونکہ طرز تعلیم نہایت مہمل اور ضرر رساں تھا۔ معلّمین صرف و نحو کی دقیق اصطلاحات استعمال کرتے وقت اس بات کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے کہ یہ اصطلاحات طلباء کی سمجھ سے باہر ہیں"۔ مایوس ہو کر محمد عبدہ مدرسہ سے بھاگ کھڑے ہوئے اور تین مہینہ تک اپنے چچا کے مکان میں روپوش رہے۔ بالآخر ان کے بڑے بھائی نے ان کی ٹوہ لگائی اور انہیں مدرسہ واپس لے گئے۔ لیکن محمد عبدہ کو اتنا کامل یقین ہو گیا تھا کہ وہ عربی صرف و نحو سے بالکل بے بہرہ رہیں گے کہ اپنا تھوڑا بہت سامان لے کر وہ وطن واپس چلے آئے اور یہاں اس ارادہ سے کہ اپنے دوسرے اہل خاندان کی طرح وہ بھی زراعت کریں گے انہوں نے سولہ سال کی عمر میں شادی کر لی۔

اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں وہ لکھتے ہیں۔ "یہ پہلا تاثر تھا جو طنطہ کے طرز تعلیم سے میرے دل و دماغ نے قبول کیا اور یہی طرز تعلیم آج تک جامعہ ازہر میں رائج ہے۔ ننانوے فی صدی طلباء اس طرز تعلیم سے یہی تاثر لے کر نکلتے ہیں بجز ان چند خوش قسمت نوجوانوں کے جو کسی ایسے معلّم کے زیر تعلیم رہتے ہیں جو پرانے طریقہ تعلیم کو پس پشت ڈال دیتا ہے

جس میں طلبا کی صلاحیتوں کا اندازہ کیے بغیر معلم اپنا ذہنی سرمایہ ضائع کرتا رہتا ہے لیکن زیادہ تر طلبا ایسے ہوتے ہیں جو معلم کے بیان کردہ مطالب و تشریحات کو تو بالکل نہیں سمجھتے ہیں مگر اپنے نفس کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں حتیٰ کہ وہ سن و سال کی پختگی کو پہنچ جاتے ہیں اور پھر بھی بچوں کی طرح خواب و خیال کی دنیا میں زندگی بسر کرتے رہتے ہیں اور بالآخر قوم و ملک کے لیے وبال جان بن جاتے ہیں"۔ ایک خطبہ میں جو انہوں نے ۱۸۸۴ء میں ٹیونس کے ایک مجمع کے سامنے دیا تھا اور جس میں انہوں نے عربی صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم کے لیے بہتر طریقہ کار اختیار کرنے پر زور دیا تھا انہوں نے بچپن کے انہیں تلخ تجربات کا تذکرہ کیا اور قدیم طرز تعلیم کے نقصان دہ اثرات کی توضیح بھی کی۔

لیکن اپنی تقدیر سے وہ اس طرح بھاگ کر بچ نہیں سکتے تھے شادی کے چالیس روز بعد ان کے والد نے پھر انہیں اپنے پرانے مدرسہ میں شریک ہونے پر مجبور کیا۔ راستہ میں موقع پا کر وہ دوبارہ بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک رشتہ دار کے گھر چھپ رہے۔ جس خطبہ کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے اسی میں محمد عبدہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ "یہاں مجھے ایک ایسے شخص سے سابقہ پڑا جس نے مجھے بتلایا کہ حصول علم کا قریب ترین راستہ کون سا ہے۔ یوں مجھے تحصیل علم سے شغف پیدا ہوا اور میں علم کی چاشنی سے پہلی بار لذت گیر ہوا۔ اسی کے بعد سے میں ثابت قدمی کے ساتھ تلاش علم کے راستہ پر جادہ پیما ہوا"۔

یہ صاحب جن کا حوالہ محمد عبدہ نے اپنے خطبہ میں دیا ہے اور جنہوں نے ان کے سینہ میں علم اور مذہبیت کا چراغ روشن کیا ان کے ایک چچا شیخ درویش قادر تھے۔ یہی صاحب ان کے حقیقی معلم تھے اور انہیں نے اس طفل گریز پا کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ یہ بزرگ لیبیا (LYBIA) کے ریگستان کا سفر کیے ہوئے تھے بلکہ طرابلس تک ہو آئے تھے۔ یہاں انہوں نے ایک صوفی بزرگ

سید محمد المدنی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا اور صوفیوں کے گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ حافظ قرآن بھی تھے اور قرأت میں بھی بہت کچھ مہارت رکھتے تھے۔ جس روز محمد عبدہ اُس گاؤں میں وارد ہوئے اسی روز صبح کو ان کے بیان کے مطابق شیخ درویش ان سے ملنے آئے۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک کتاب لیے ہوئے تھے جس میں وہ تمام روحانی اور اخلاقی ہدایات درج تھیں جن پر اُس حلقۂ صوفیا کے شرکا رعامل تھے۔ انھوں نے محمد عبدہ سے اس کتاب کے بعض حصوں کو سنانے کی فرمائش کی۔ مگر یہ تو کتابوں سے پہلے ہی بیزار بیٹھے تھے کتاب لے کر زمین پر پٹک دی۔ شیخ نے دوبارہ سہ بارہ منت و سماجت سے اپنی فرمائش کا اعادہ کیا۔ آخر کہاں تک اثر نہ ہوتا غیرت کے مارے کتاب اُٹھا کر محمد عبدہ نے اس کے چند حصے شیخ کو سنائے۔ شیخ نے ساتھ ہی ساتھ ان حصوں کے معانی و مطالب کی کچھ اس طرح توضیح کی کہ محمد عبدہ کے دل میں علم و مطالعہ سے جو نفرت پیدا ہو گئی تھی اور اپنی فہم و صلاحیت کی نسبت جو شکوک اُن کے دل میں جمے ہوئے تھے سب دور ہو گئے مگر ذرا دیر بعد ہی چند لڑکے کھیل کود کے لیے انہیں بلانے آئے اور وہ کتاب پھینک کر چلتے بنے۔ اُسی روز دوپہر کو اور دوسرے روز صبح کو شیخ نے پھر وہی عمل کیا۔ تیسرے روز کتاب پڑھنے میں معمول سے زیادہ وقت صرف ہوا یہاں تک کہ محمد عبدہ کو پڑھنے سے ایسی دلچسپی ہو گئی کہ وہ از خود کتاب پڑھتے گئے اور اُس کے بعض اہم مقامات پر نشان بھی لگائے۔ پانچویں روز کے بعد سے انہیں کھیل کود اور ہر اُس چیز سے جو مطالعہ میں حارج ہوتی تھی اتنی ہی نفرت پیدا ہو گئی جتنی نفرت انہیں پہلے کتابوں سے تھی۔ شیخ نے انہیں صوفیانہ اعمال و عقائد کی تعلیم دی اور پہلی بار فہم قرآن سے روشناس کیا۔ مزید برآں شیخ نے انہیں ایک ایسی صداقت کی تلقین کی جو وحی الٰہی کی طرح اُن کے دل میں اُتر گئی اور وہ یہ کہ مسلمان جو نیک عملی اور راست کرداری کی زندگی نہ بسر کرے حقیقت میں مسلمان نہیں ہے۔

پندرہ دن اس طرح مصروف مطالعہ رہنے کے بعد محمد عبدُہ اپنے قدیم مدرسہ کو واپس ہوئے۔ لیکن اب ان میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ اس قلیل مدت میں جو انھوں نے شیخ کی معیت میں بسر کی وہ صوفیانہ زندگی کے شیدائی بن چکے تھے۔ شیخ کی ملاقات کے آٹھ ہی روز بعد انھوں نے صوفیانہ مجاہدات کی مشق شروع کر دی۔ وہ خود لکھتے ہیں " ان مجاہدات کو شروع کیے ہوئے آٹھ ہی روز ہوئے تھے کہ میرے قلب و ضمیر میں ایک حیرتناک انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ راستہ جو مجھے اتنا تنگ اور دشوار گزار نظر آتا تھا اب میرے لیے کشادہ ہو گیا۔ دنیا کی زندگی جو مجھے اس قدر بھاتی تھی میری نظروں میں حقیر ہو گئی۔ حصول علم کی آرزو اور وصالِ الٰہی کی تڑپ میرے دل میں ہنگامہ زا تھی۔ میرے تمام افکار میری سب پریشانیاں مٹ گئی تھیں۔ صرف ایک فکر صرف ایک اضطراب افزا خیال میرے ذہن و دماغ پر قبضہ کیے ہوئے تھا اور وہ یہ تھا کہ میں علم کے کمال اور روحانی تربیت کی پختگی کا درجہ حاصل کر لوں۔ مجھے اس وقت تک کوئی ایسا رہنما میسر نہیں آیا تھا جو مجھے میرے قلبی میلانات کے راستہ پر چلا سکتا بجز اس شیخ کے جو مجھے چند روز کے اندر جہل و بے خبری کے تنگ و تاریک زندان سے علم و آگہی کی وسیع اور کشادہ سرزمین پر لے آیا اور جس نے مجھے تقلید کی بندشوں سے آزاد کر کے صوفیانہ اسرار و رموز سکھا دیئے۔ شیخ مذکور نے میری پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارا اور میری فطری ودیعتوں کو جگایا جن کے وجود ہی سے میں سراسر بے خبر تھا۔

ان تجربات کے ساتھ محمد عبدہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا تصوف سے ان کی دلچسپی رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھی کہ اُن کی زندگی کا مرکز و محور بن گئی۔ اور شیخ نے ان کی ہدایت و رہبری کا پورا پورا حق ادا کیا۔

اگر یہ اثرات جاری رہتے تو محمد عبدُہ کی مستقل زندگی دنیا سے دور گوشہ نشینی اور عزلت میں گزر جاتی اور ان کے عملی اور علمی کارنامے جن پر ان کی شہرت و عظمت کا دار و مدار ہے پردہ عدم سے عالم وجود

میں نہ آئے لیکن بہت جلد انہیں علامہ جمال الدین افغانی سے سابقہ پڑا جنہوں نے اس جذب و انہماک اور خود فراموشی کے عالم سے نکال کر انہیں عملی زندگی کے راستہ پہ قدم زن کیا۔

طالب علمی کی زندگی ۱۸۶۵ء تا ۱۸۷۷ء اکتوبر ۱۸۶۵ء میں شیخ درویش سے اس یادگار ملاقات کے بعد محمد عبدہ طنطہ واپس ہوئے۔ جہاں انہوں نے دو معلموں کے تحت تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ان کی مسرت کی کوئی حد نہ رہی جب انہوں نے محسوس کیا کہ اُن کی گذشتہ بد ذوقی اور دماغی کاہلی پوری طرح دور ہو گئی ہے اور استاد جو کچھ پڑھاتے ہیں وہ اس کو بخوبی سمجھ رہے ہیں۔ جب دوسرے لڑکوں کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ پروانوں کی طرح محمد عبدہ کے گرد جمع ہونے لگے تاکہ ان کی قابلیت اور صلاحیت فہم سے فائدہ اُٹھائیں۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اُن کے دل میں جامعہ ازھر کی شرکت کا شوق پیدا ہوا اور فروری ۱۸۶۶ء میں انہوں نے اپنے قدیم مدرسہ کو الوداع کہا اور کچھ عرصہ بعد جامعہ ازھر میں شریک ہو گئے۔

سلطان ابو تمیم معز کے جنرل جوہر نے مصر کی فتح اور نئے دار الخلافہ قاھرہ کی تعمیر کے بعد ۹۷۰ء میں مسجد الازھر تعمیر کروائی تھی وقتاً فوقتاً فاطمیہ سلاطین نے اس مسجد کی توسیع کی اور اس میں ایک مدرسہ بھی تعمیر کیا۔ جب مغل حملہ آوروں کے سیلاب نے مشرق میں علوم و فنون کے بڑے بڑے مرکزوں کو تاراج کر دیا اور مغرب میں اسلامی سلطنت زوال پذیر ہو گئی تو دنیائے اسلام میں ازھر کے مدرسہ کا نام اور بھی چمکا اور صدیوں تک یہ مدرسہ اسلامی علوم و فنون کا مرکز بنا رہا اور اسلامی ممالک کے ہر گوشہ سے اس نے تشنگان علم کو کشاں کشاں کھینچ بلایا۔

ازھر کا مدرسہ جامعہ ازھر کے نام سے موسوم ہے کیونکہ قریب قریب جملہ اسلامی علوم کی تعلیم یہاں دی جاتی ہے لیکن مغرب میں لفظ جامعہ جن معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے ان معنوں میں مدرسہ ازھر پر لفظ جامعہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہے۔ اس میں جو کچھ تعلیم دی جاتی ہے وہ سراسر مذہبی ہے فہم قرآن کی صلاحیت اور اسلامی عقائد و اعمال سے واقفیت علوم کی قدر و قیمت کا پیمانہ ہے۔ روایت

پرستی کی روح صدیوں سے جامعہ ازھر کی تعلیمی کوششوں میں جاری و ساری ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ علمی تحقیقات اور چھان بین کے ذریعہ علوم کو ترقی دی جائے تعلیم کا کام بس اتنا ہے کہ اس کے ذریعہ قدماء کا ذہنی سرمایہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہے اور وہ بھی بجنسہٖ اسی حالت میں جس میں کہ وہ ہر نسل کو ملتا رہا ہے۔ آزادانہ تحقیق اور غیر پابند قوت فیصلہ کی نشو و نما کا دروازہ تیسری صدی ہجری سے بند ہے۔ اس لیے مذہب کے مستند شارحین صرف ماضی کے دور دراز گوشوں میں ملتے ہیں اور متاخرین کے لیے صرف یہی کام رہ گیا ہے کہ وہ قدماء کے علمی سرمایہ کی شرح کیا کریں۔

جامعہ ازھر میں مختلف علوم و فنون کو جو اضافی اہمیت حاصل ہے اس سے بھی روایت پرستی صاف عیاں ہے۔ سب سے زیادہ اہمیت علوم نقلیہ کو حاصل تھی۔ یہ علوم حسب ذیل ہیں:۔

علم الکلام۔ علم التوحید۔ تفسیر۔ حدیث۔ علم فقہ اور اصول فقہ اس کے بعد علوم عقلی کا درجہ تھا اور وہ علوم یہ ہیں:۔ علم صرف و نحو۔ علم عروض۔ علم البلاغت۔ علم المعانی والبیان۔ علم منطق اور علم ہیئت۔ اساتذہ اپنے طالب علموں کو جو ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے کسی ایسے مصنف کی کتاب پر لکچر دیتے تھے جو مضمون زیر بحث کا مسلم الثبوت استاد تسلیم کیا جاتا ہو۔ لیکن طلباء کے پاس کوئی درسی کتاب نہیں ہوتی تھی۔ طالب علم کا کام یہ تھا کہ وہ مابعد کے شارحین کی کوئی شرح جو اس کتاب پر لکھی گئی ہو زبانی یاد کرے اور جو طالب علم اس طرح کتاب کی شرح حفظ کر لیتا تھا اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ اس مضمون پر حاوی ہو گیا ہے۔

وقتاً فوقتاً جامعہ ازھر کے نصاب اور طریقۂ تعلیم میں اصلاح کی کوششیں کی گئیں لیکن کامیابی بہت کم نصیب ہوئی۔ محمد علی پاشا اگرچہ خود ناخواندہ تھا لیکن مغربی علوم کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس نے مصر میں ان علوم کی اشاعت کی جانب کچھ توجہ بھی کی تھی۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء میں اس نے ایک تعلیمی مشن پیرس بھیجا تاکہ وہاں سے تربیت حاصل کرنے کے بعد اساتذہ ان علوم کی اشاعت مصر

میں کریں۔ مغربی علوم کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ بھی عربی زبان میں کیا گیا۔ ان کتابوں میں زیادہ تر کتابیں فرانسیسی زبان کی تھیں لیکن ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ ازھر کے اساتذہ اور متعلمین کی مخالفت مول لینا پڑی۔

تاہم اس زمانہ میں (۱۸۲۰ء) شیخ الطنطاوی نے جو بعد میں سینٹ پیٹرس برگ میں عربی زبان کے معلم مقرر ہوئے الحریری کی کتاب 'مقامات' پر لکچر دینا شروع کیے۔ جو نہ صرف نہایت دقیق معانی اور مغلق الفاظ سے پر ہے بلکہ اپنے حریت نواز خیالات کی وجہ سے بھی ممتاز ہے۔ اس قسم کے لکچر اس سے پہلے کبھی نہیں دیئے گئے تھے۔

جامعہ ازھر میں محمد عبدہ کی شرکت کے تھوڑے عرصہ بعد ہی خدیو اسمٰعیل نے مصر کو مغربانے (WESTERNIZE) کے شوق میں جامعہ ازھر کی اصلاح کے لیے کوششیں شروع کیں۔ اس کام میں خدیو اسمٰعیل کو شیخ محمد العباسی المهدی کی تائید بھی حاصل تھی جو اس زمانہ میں جامعہ ازھر کے شیخ تھے اور جن کا شمار اکابر علماء میں ہوتا تھا۔ جامعہ کے نظم و نسق اور نصاب میں متعدد اصلاحیں کی گئیں جن میں سب سے اہم اصلاح یہ تھی کہ امتحان کا طریقہ رائج کیا گیا کیونکہ اس سے پہلے طلباء کو کسی قسم کا امتحان نہیں دینا پڑتا تھا۔ لیکن ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت پرستوں نے شیخ علیش کی سرکردگی میں اس تحریک کی مخالفت میں آسمان و زمین ایک کر دیئے۔ اس لیے جب ۱۸۶۶ء میں محمد عبدہ جامعہ ازھر میں شریک ہوئے تو اصلاحی تحریک سرد پڑ چکی تھی اگرچہ شیخ حسن الطویل منطق اور فلسفہ پر لکچر دے رہے تھے۔

جس وقت محمد عبدہ نے جامعہ ازھر کی چار دیواری میں قدم رکھا تو شاید ان کی شکل و صورت اور گفتار میں کوئی نمایاں خصوصیت ایسی نہ تھی جس کی وجہ سے وہ ازھر کے اساتذہ کی نظروں میں ان سینکڑوں ہزاروں طلباء سے ممتاز ہوتے جو اطراف ملک سے اس مرکز علم میں جمع ہوتے تھے۔

لیکن بہت جلد ان کی فطری استعداد، جودت طبع اور ان کی آزاد اور غیر پابند قوت فیصلہ نے انہیں دوسرے طلبا ء سے ممتاز کر دیا۔ چار سال تک جامعہ کے مقررہ نصاب کی انہوں نے تکمیل کی اور مختلف درسوں میں پابندی کے ساتھ حاضر رہے۔ ان کی بے قرار طبیعت نے انہیں ایسے درسوں میں شرکت کرنے سے باز رکھا جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے وہ ایسی جماعتوں سے غائب رہتے تھے جن میں شریک ہونے سے انہیں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ ان اوقات میں وہ اپنا وقت مطالعہ کتب میں گزارتے تھے۔ اسی زمانہ میں وہ جامعہ ازھر کے کتب خانہ میں ایسے مضامین کی کتابوں کی تلاش میں مصروف تھے جن کی تعلیم ازھر میں نہیں ہوتی تھی۔

ان کے قدیم معلّم اور روحانی پیشوا شیخ درویش انہیں منطق ریاضی اور اقلیدس جیسے مضامین کے مطالعہ کا شوق دلاتے رہتے تھے اور انہیں اس کی پرواہ نہ تھی کہ ان علوم کے حصول کے لیے محمد عبدُہ کو ازھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا پڑے گا۔ ایک معلّم جن سے انہوں نے اس زمانہ میں مدد لی تھی شیخ البیسونی تھے۔ اس کے بعد انہوں نے شیخ حسن اناویل سے جن کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے منطق اور فلسفہ کے درس لیے۔ لیکن شیخ حسن بھی ان کے دل کی پیاس نہ بجھا سکے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ شیخ کا طریقۂ تفہیم دل نشین اور واضح نہیں ہے بلکہ ان کی تشریح و توضیح کا دارومدار تمام تر قیاسات اور مفروضات پر ہے۔ محمد عبدُہ اس وقت تک کسی مضمون کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے جب تک کہ وہ اس پر پوری طرح سے حاوی نہیں ہو جاتے تھے اور آخر آخر میں تو ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ کسی مضمون کو ایک مرتبہ سمجھ لینے کے بعد اس وقت تک اس کے مشتملات پر یقین نہیں کرتے تھے جب تک اس کی موافقت میں کافی ثبوت فراہم نہ ہو جاتا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد جب وہ عملی زندگی بسر کر رہے تھے تو انہوں نے کئی بار اس کا اظہار کیا کہ ازھر کے طریقۂ تعلیم کے مطابق عربی کتب کا مطالعہ کرنے سے ان کے ذہن و دماغ کو سخت نقصان پہنچا ہے اور باوجود اس کوشش

کے کہ اپنے ذہن سے اس طریقہ تعلیم کے اثرات کو دفع کر دیں انہیں اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔

جس وقت محمد عبدہ جامعہ ازھر میں داخل ہوئے وہ صوفیانہ افکار و عقائد کے زیر تسلط تھے دن کے وقت باوجود اپنے تعلیمی فرائض کے وہ روزہ رکھتے تھے رات رات بھر نمازیں پڑھتے اور کلام مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ کپڑے بھی وہ نہایت معمولی اور نا ملائم قسم کے پہنتے تھے۔ آنکھیں نیچی کیے ہوئے راستہ چلتے تھے اور کسی سے اس وقت تک بات نہیں کرتے تھے جب تک کہ شدید ضرورت نہ پیش آجاتی۔ آخر کار مراقبہ، مطالعہ، ضبط نفس غرضکہ رہبانیت اور تقشف کے جملہ لوازم میں انہیں ایسا غیر معمولی انہماک پیدا ہو گیا کہ بعض اوقات عالم محسوسات سے پرے وہ فکر و خیال کی ایسی دنیا میں پہنچ جاتے تھے جہاں بقول ان کے وہ گزشتہ زمانہ کی ارواح سے گفتگو کیا کرتے تھے۔

بالآخر وہ صوفیانہ جذب، انہماک اور انقطاع علائق کے ایسے مرتبہ پر پہنچ گئے کہ ان کے معلم اور روحانی پیشوا شیخ درویش کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ انہیں انسانوں کی طبعی زندگی کی طرف پھر کھینچ بلائیں چنانچہ شیخ نے انہیں بتایا کہ ان کا سارا علم بیکار ہو جائے گا اگر اس کی مدد سے انہوں نے خود اپنی اور اپنے ہم قوموں کی صحیح رہنمائی نہ کی۔ شیخ نے انہیں یہ بھی سمجھایا کہ اگر وہ اپنے علم و فضل سے اپنے ہم مذہبوں کو فائدہ پہنچانا اور انہیں مذہب کی سچی پیروی کرنے کے قابل بنانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ ان میں گھل مل کر زندگی بسر کریں۔ شیخ نے انہیں ایسے جلسوں اور مجمعوں میں پہنچانا شروع کیا جہاں لوگ ان سے گفتگو کرتے تھے اور مختلف مضامین پر بحث و مباحثہ میں انہیں شریک ہونا پڑتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ شیخ نے انہیں پھر ایک بار حقیقی زندگی سے روشناس کیا۔

لیکن حقیقتاً جس شخص نے انہیں بالآخر صوفیانہ استغراق سے نکال کر عملی زندگی کے قابل بنایا وہ سید جمال الدین افغانی تھے۔ اگرچہ تصوف کا ذوق و میلان آخر عمر تک محمد عبدہ کا رفیق رہا چنانچہ ان کی کتاب رسالات الواردات میں جو ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی تھی صوفیانہ تجربات اور تصوف کے مطالع

کے اثرات خاص طور پر نمایاں ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جمال الدین افغانی کی صحبت ہی نے انہیں دنیائے عمل کی طرف پھر رغبت دلائی اور انہیں کے اثر سے انھوں نے اپنی کشتی کو زندگی کے بحر مواج اور اس کے تھپیڑوں اور طوفانوں کے سپرد کیا۔ رسالات الواردات کی تمہید میں وہ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ان کے دل میں علم کی لگن پیدا ہوئی اور سید جمال الدین کی آمد سے قبل کس طرح وہ اس راہ میں بے نیل و مرام جادہ پیمائی کر رہے تھے۔ انہیں علم کی تلاش تھی لیکن منزل مقصود کا سراغ دینے والا کوئی نہ تھا۔ جب وہ کسی عالم سے مدد طلب کرتے تھے تو انہیں جواب ملتا تھا کہ اس قسم کے مضامین کا مطالعہ بالکل ناجائز ہے۔ وہ لکھتے ہیں "جب میں نے اس کی وجہ سوچی تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب کوئی شخص کسی چیز سے ناواقف ہوتا ہے تو اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے"۔ محمد عبدہ علم کی تلاش میں اسی طرح حیران و سرگشتہ تھے کہ دفعتاً ان کے قول کے مطابق سچائی کا وہ سورج طلوع ہوا جس کی روشنی میں ان کی علمی کاوشوں کو سکون کا آغوش میسر آیا اور انہیں ایک ایسی دنیا کا نظارہ حاصل ہوا جس میں ان کے ذوقِ تصوف کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ جمال الدین خود صوفی تھے اور راہ طریقت کے سالک رہ چکے تھے۔ محمد عبدہ سے کہیں زیادہ ان تمام تجربات و کیفیات کا علم رکھتے تھے جن سے صوفیوں کو گزرنا پڑتا ہے۔ اس لیے محمد عبدہ کو اپنے صوفیانہ کمالات کا قائل بنانے میں ان کو چنداں دقت نہ ہوئی اور انھوں نے بہت جلد محمد عبدہ کو تصوف کی فسوں کاریوں اور سحر طرازیوں سے چھڑا لیا حالانکہ اس عالم میں داخل ہونے کے بعد بہت کم ایسے ہیں جو پھر حقائق کی دنیا میں واپس ہوئے ہوں۔ جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی پہلی ملاقات۔ تصوف ہی پر بحث کی ابتدا ہوئی۔ قاہرہ میں سید جمال الدین افغانی کی آمد کے بعد[1] محمد عبدہ شیخ حسن الطاویل کے ساتھ ان سے ملاقات کے لیے گئے۔ اس وقت وہ کھانا کھا رہے تھے۔ سلسلہ گفتگو میں جمال الدین افغانی

۱؎ یہ ۱۸۶۹ء کا واقعہ ہے۔

نے یہ بحث چھیڑی کہ کلام مجید کی بعض آیات کا مفہوم علماء کے نزدیک کچھ ہے اور صوفیاء کے نزدیک کچھ۔ غرضیکہ موضوع بحث تفسیر اور تصوف کا تقابل تھا اور یہی بحث محمد عبدہ کی دلچسپی کا مرکز بنتی معلوم ہوتا ہے کہ جمال الدین اپنی گہری بصیرت کی بنا پر محمد عبدہ کے ذوق و میلان کو تاڑ گئے اسی لیے اس نوجوان طالب علم کو انھوں نے اتنی آسانی سے اپنا متبع بنا لیا۔

جب ڈیڑھ سال بعد جمال الدین افغانی قسطنطنیہ سے واپس ہوئے تو محمد عبدہ باقاعدہ طور سے ان کی علمی مجلسوں میں شرکت کرنے لگے اور سایہ کی طرح ان کے پیچھے پیچھے رہنے لگے۔ ان کا ذوق و شوق رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھا کہ انھوں نے اپنے بہت سے ساتھیوں کو ان مجالس میں شرکت کی دعوت دی جو جمال الدین افغانی کی قیام گاہ پر منعقد ہوتی تھیں۔ جہاں نہ صرف وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسے ایسے قدماء کی کتابوں کو پڑھتے اور ان پر بحث مباحثہ کرتے تھے جن کو زمانہ نے فراموش کر دیا تھا بلکہ اپنی طلاقت لسانی اور شیریں کلامی سے شرکاء کو مسحور کر دیتے تھے۔ ان کے فیضان علم سے کوئی شخص محروم نہ جاتا تھا خواہ وہ علم کا جویا ہو یا جہل کا پتلا۔ عربی کتب کی تفہیم کا طریقہ جسے علامہ جمال الدین افغانی نے اختیار کیا تھا ازہر کے طریقۂ تفہیم سے بہت مختلف تھا۔ کبھی تو وہ کسی موضوع بحث کی توضیح ایسے صاف سیدھے طریقہ سے کرتے تھے کہ وہ سننے والے کے ذہن نشین ہو جاتا پھر وہ کتاب لے کر اس میں سے کوئی متعلقہ اقتباس پڑھتے تھے اور بتاتے تھے کہ وہ موضوع زیر بحث پر کہاں تک منطبق ہو سکتا ہے۔ اور کبھی وہ کتاب کا کوئی حصہ پڑھ کر سناتے تھے اور اس کی مخالفت اور موافقت میں دلائل پیش کرتے تھے اور بالآخر ثابت کرتے تھے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ غلط ہے یا صحیح ہے پھر وہ اپنی ذاتی رائے سے بھی آگاہ کرتے تھے۔ یہ بات ان کی طبیعت کے بالکل خلاف تھی کہ کتاب صرف سمجھ لی جائے اور مصنف کی رائے یا فیصلہ سے اتفاق کر لیا جائے۔ قدماء کی کتابوں پر لکچر ختم کر چکنے اور ان میں ایک نئی روح پھونک دینے کے بعد وہ اپنے شاگردوں

کو مختلف علوم کی ان کتابوں سے روشناس کراتے تھے جن کا ترجمہ عربی زبان میں ہو چکا تھا۔ اس طرح سے محمد عبدہ پر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوا یعنی مغربی علوم و فنون کی دنیا کا۔ یہ چیز اُن کی زندگی کے لیے اُس آزاد خیالی کے اثرات سے کچھ کم فیصلہ کن نہ تھی جس کا مظاہرہ علّامہ جمال الدین اس وقت کرتے تھے جب وہ قدماء کے دلائل و افکار پر تنقید شروع کرتے تھے۔ علّامہ موصوف نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنے شاگردوں کو ادبی سیاسی اور عمرانی موضوعوں پر اخباری مضامین لکھنا سکھایا اور ساتھ ساتھ ان کی تقریری صلاحیتوں کو بھی ابھارا۔ کچھ عرصہ بعد محمد عبدہ مقرر کی حیثیت سے اپنے استاد پر بھی گوے سبقت لے گئے کیونکہ عربی ان کی پیدائشی زبان تھی اور علّامہ کے لیے یہ علم و فضل وہ ایک اکتسابی شے تھی محمد عبدہ نے علّامہ کی دو تقریروں کا خلاصہ ہم تک پہنچایا ہے پہلی تقریر فلسفہ تعلیم پر ہے۔ اس تقریر میں وہ اخلاقی صحت کو جسمانی صحت سے مشابہ قرار دیتے ہیں جس طرح جسم کی صحت کا دارومدار متضاد اور متصادم میلانات و عناصر کے صحیح توازن پر ہے اس طرح کہ کوئی عنصر یا میلان دوسرے سے فوری تر نہ ہو جائے۔ اسی طرح اخلاقی حالت کی درستگی بھی اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جبکہ دو متضاد میلانات میں توازن پیدا ہو جائے مثلاً خوف اور جرأت سخاوت اور بخالت۔ اگر ان دو صفات میں سے کوئی ایک دوسرے پر غالب آجائے تو اخلاقی توازن بگڑ جاتا ہے تعلیم اور ضبط (DISCIPLINE) کا یہی مقصد ہے کہ اخلاقی صفات کو تخریب سے بچایا جائے یا اگر وہ ضائع ہو جائیں تو انہیں پھر بحال کر دیا جائے۔ تزکیہ اخلاق کا کام جن لوگوں کے سپرد ہے وہ روح کے معالج ہیں۔ یہی لوگ معلم اور اساتذہ کہلاتے ہیں۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اخلاقی صحت کے اصولوں سے واقف ہوں جس طرح حکیم یا ڈاکٹر جسمانی صحت کے اصولوں سے واقفیت رکھتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی قوم اور دیگر اقوام کی تاریخ ان کے عروج و زوال کے ادوار ان کی اخلاقی خرابیوں اور ان خرابیوں کو رفع کرنے کی تدبیروں سے بخوبی واقف ہونا چاہیے۔ اگر یہ روحانی معالج جہل و لاعلمی

میں مبتلا ہیں تو مریض کا خدا ہی حافظ ہے۔ معالجین کا جہل اور ان کی لاعلمی ہر قسم کے جہل سے بدتر ہے۔ ان معالجوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اول خطیب اور مقررین، دوئم اہل قلم شعراء اور مصنفین۔

دوسری تقریر میں انسان کے عقلی اور عمرانی ارتقاء کی مختلف منزلوں کے تذکرہ اور منفعت بخش علوم وفنون کی قدر وقیمت اور ان کے نشو وارتقاء کے عمل کو بتلانے کے بعد انہوں نے علوم وفنون اور افراد کے درمیان تعاون کی ضرورت کو ثابت کیا۔ علوم ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہیں اور خود انسان اپنی معمولی ضروریات تک کے لیے علم وفن کی مدد کا محتاج ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ انسان کو اپنی ضروریات کے لیے علوم وفنون کے نتائج وثمرات کی اعانت درکار ہے وہ کس طرح بالکل خود مختار اور آزاد کہا جا سکتا ہے۔ اسی لیے باہمی تعاون ضروری ہے تاکہ ہر شخص اپنی محنت کا معاوضہ دوسروں کی مشقتوں کے نتائج سے حاصل کر سکے۔ اس طرح انسانی سماج ایک ایسے جسم کی مانند ہے جس کا ہر عضو کل جسم کے فائدہ کی خاطر اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ جو شخص اس باہمی تعاون کی ضرورت پر یقین رکھتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ جسمانی اعضا کی طرح دوسرے کے ساتھ پورے سماج کی خاطر اپنا کام انجام دے۔ جو شخص سماج کا کوئی کام نہیں کرتا ہے وہ ایک عضوِ مفلوج ہے جو جسمانی حرکت میں حارج ہوتا ہے۔

علامہ افغانی نے اپنے شاگردوں کو صرف تعلیم ہی نہیں دی بلکہ اس سے زائد تر اور کچھ بھی عطا کیا۔ علامہ موصوف کے پیدا کیے ہوئے ادبی احیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جرجی زیدان لکھتا ہے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا علامہ نے ان شاگردوں کے اندر اپنی زندہ پُرجوش اور بے قرار روح پھونک دی تھی انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ تاریکی مٹ چکی ہے اور ہر طرف روشنی پھیلی ہے علم وفضل کے اس فیضان کے علاوہ جس سے ان کے شاگرد متمتع ہوئے تھے انہوں نے علامہ کی مضطرب روح

اپنے اندر جذب کر لی تھی جس نے اُن کی آنکھوں کے سامنے حقیقت و اصلیت بے نقاب کر دی اور اُن کے قلب و ذہن پر باطل تصورات و افکار کے جو پردے پڑے ہوئے تھے سب یک بیک مرتفع ہو گئے انہوں نے قلم ہاتھ میں لیا اور فلسفہ ادب اور سیاسیات کے ہر موضوع پر طبع آزمائی شروع کر دی ۔

وہ زمانہ بھی جس میں علامہ جمال الدین نے اپنی شخصیت کے اثر سے ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی تھی ان حالات کے لیے موافق تھا ۔ خدیو اسمٰعیل مغربی تصورات و افکار مصر میں اس تیزی سے داخل کر رہا تھا کہ اہل مصر میں ان کے جذب کرنے کی طاقت نہ تھی لیکن ان کوششوں کے نتائج سطحی تھے یعنی تعلیم یافتہ حلقوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اُن کا ملک ایک پُر شوکت دورِ ترقی سے گزر رہا ہے اور یہ بھی محسوس کیا جانے لگا کہ یہ تعلیم یافتہ گروہ خود اس حرکت و ترقی کے پیدا کرنے کا محرک ہو رہا ہے ۔

حالانکہ خدیو اسمٰعیل کی کوششیں مغربی اقوام کی مداخلت کے لیے راستہ ہموار کر رہی تھیں اور سطحی تبدیلیوں سے ترقی کا دھوکا کھا کر لوگوں کی نظروں سے یہ حقیقت اوجھل ہو گئی تھی ۔ یہی چیز علامہ جمال الدین کے مقاصد کے خلاف تھی ۔ مغربی مداخلت اور غلبہ کا خوف انہیں ہر وقت لگا رہتا تھا اُس آنے والی شب کی تاریکی اسی وقت سے پھیلنا شروع ہو گئی تھی اگرچہ آمدِ شب میں ابھی دیر تھی ۔

مستقبل کا ایک ہلکا سا عکس ہمیں محمد عبدہ کے اُن مضامین میں ملتا ہے جو انہوں نے اُس زمانہ میں لکھے تھے اور جنہیں محمد عبد الرشید رضا نے ان کی سوانح عمری میں نقل کیا ہے ۔ اس میں سے ایک مضمون جس میں مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے قاہرہ کے ایک مشہور اخبار الاہرام میں شائع ہوا تھا ۔ اس میں نوجوان محمد عبدہ مصر کی عظمتِ رفتہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مصر کی سلطنت سب سے زیادہ قدیم اور پُر شوکت سلطنت تھی جس وقت دنیا کے دوسرے حصوں میں وحشت و بربریت کا دور دورہ تھا مصر تمدن و تہذیب کے پورے عروج پر تھا ۔ بالآخر یہی تمدن مغربی اقوام کی موجودہ عظمت کا بانی مبانی ہوا اور ہماری تہذیب ان قوموں میں منتقل ہو کر اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی ہے لیکن گردش

لیل ونہار سے اب مصر پھر اپنے قدیم رتبہ کے حصول کا آرزومند ہے اور اس کی گذشتہ تمدنی عظمت اب پھر اس کی طرف پلٹ رہی ہے اور یقین ہے کہ دورِ جدید میں اُس کی یہ عظمت اُس حد سے بھی بڑھ جائے گی جہاں آکر وہ تعمیر اہرام کے زمانہ میں رُک گئی تھی اس دور میں انہوں نے جو دوسرے مضامین لکھے تھے ان سے بھی اس حرکت و بیداری کا پتہ چلتا ہے جو مصر میں اُس وقت پیدا ہو رہی تھی۔ ان مضامین میں علامہ جمال الدین کی تعلیم و تربیت کا اثر نمایاں ہے۔

دوسرے مضمون میں فن تحریر پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس فن نے انسان کی تہذیبی اور تمدنی ترقی میں کیا حصہ لیا ہے اور آخر میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس فن کے ذریعہ اخباروں اور رسالوں کو مذہبی اور سیاسی معاملات میں قوم کی صحیح رہنمائی کرنا چاہیے۔ تیسرا مضمون انسانی اور روحانی فائدین پر ہے۔ انسانی فائدے سے مراد آدمی کی جسمانی حالت ہے جس کا تعلق اس کی جسمانی فلاح سے ہے۔ روحانی فائدے سے مراد اس کے ذہن و عقل کی قوتیں ہیں جو مشکل اور پیچیدہ مسائل کو حل کرتی ہیں اور انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اُبھارتی ہیں۔ اس طرح آدمیوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو صرف حیوانی اور مادّی زندگی پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو عقل و دانش کو اپنا رہنما بنا لیتے ہیں

جوں جوں انسان مادّی اور حیوانی زندگی کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے اور عقل و دانش کی راہ پر آگے بڑھتا جاتا ہے وہ انصاف کا طالب، علم کا جویا اور دلائل کا متلاشی ہو جاتا ہے۔ یہاں تک تو مضمون میں فلسفیانہ اور اخلاقی رنگ غالب ہے لیکن آخری حصہ میں یہ رنگ بالکل بدل گیا ہے بعض لوگ ایسے ہیں جو صرف نام کو عقل کا اتباع کرتے ہیں۔ یہ لوگ دلیل اور سند کے بغیر اپنے عقائد پر اڑے رہتے ہیں اور فلسفہ کی تعلیم کو کفر سمجھتے ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو ملک کی موجودہ خراب حالت پر اور غیر ممالک کے بے جا تسلّط و اقتدار پر مسرور و مطمئن ہیں۔ یہ انسانیت کا ادنےٰ ترین درجہ بلکہ حیوانیت کی سطح ہے اس کے برخلاف ہمیں دشمن کے سامنے متحد ہو جانا چاہیے اور اپنی فرقہ بندیوں کو فراموش کر دینا چاہیے

مصریوں کی حالت اُن بھائیوں کی سی ہونی چاہیے جو آپس میں تو لڑتے ہیں مگر جب کسی دشمن سے مقابلہ آن پڑتا ہے تو باہمی جھگڑوں کا خیال تک دل میں نہیں لاتے ہیں۔

چوتھا مضمون دینیات اور علوم جدیدہ پر ہے۔ اس میں ازہر کے ایک طالب علم کی مثال دی گئی ہے (یہ مثال خود محمد عبدہ کی تعلیمی زندگی سے مشابہ ہے) یہ طالب علم منطق اور دینیات کا مطالعہ کرتا ہے۔ اگرچہ علوم عقلی مثلاً منطق فلسفہ وغیرہ کے حصول کی غرض یہ ہے کہ وہ مذہب کے سمجھنے میں مدد دیں لیکن اس لڑکے کے دوستوں اور عزیزوں نے ان علوم کے مطالعہ سے اس کو منع کیا اور اُس کو طرح طرح کی دھمکیاں دیں یہاں تک کہ اُس کے والد کو قاہرہ بلوا بھیجا اور لڑکے کا باپ اس وقت تک مطمئن نہیں ہوا جب تک کہ اس نے یہ حلف نہیں اُٹھا لیا کہ اس کا ایمان صحیح و سلامت ہے اور اس کا وعدہ نہیں کر لیا کہ آئندہ سے وہ ان علوم کا مطالعہ بالکل ترک کر دے گا۔ حالانکہ پوری اسلامی دنیا میں ان علوم کی تعلیم ہوتی ہے اور غزالی جیسے پابند شریعت نے ان علوم کے حصول کو فرضِ عین قرار دیا ہے۔ اور دوسرے علما بھی ان علوم کی تحصیل کو فرض کفایہ قرار دیتے ہیں ان کا مطالعہ اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ ان کی مدد سے ہم مذہب کی حمایت کر سکتے ہیں اگر ان علوم کی نسبت ہمارا طرز عمل یہ ہے تو اُن جدید علوم کے متعلق ہمارا رویّہ کیا ہوگا جن کی ضرورت کا احساس روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔ پھر موجودہ حالت میں جبکہ ہمیں متمدن اور ترقی یافتہ اقوام سے سابقہ پڑ رہا ہے اور خود خدیو اسمٰعیل علوم جدیدہ کی اشاعت میں ہمہ تن منہمک ہیں ان علوم سے ہماری بیگانگی اور بھی زیادہ مضرت رساں ثابت ہوگی۔

اس کے بعد علماء کا تذکرہ آتا ہے۔ علمائے اسلام اُمّتِ مُسلمہ کے رہنما ہیں لیکن اب تک علوم جدیدہ سے بے بہرہ ہیں۔ وہ ایسے علمی اشغال میں مصروف رہتے ہیں جن کا موجودہ حالات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اس بات کو نہیں دیکھتے ہیں کہ دنیا بہت بدل گئی ہے۔ زمانہ کا رہا ہیں دین و

مذہب اور اس کی صدیوں کی قائم شدہ عزت و آبرو کے ساتھ ایک ایسے بے برگ و گیاہ صحرا میں لے آیا ہے جو غراتے ہوئے شیروں اور تلملاتے ہوئے بھیڑیوں سے بھرا پڑا ہے جن میں سے ہر ایک شکار کی جستجو میں ادھر اُدھر دوڑا پھرتا ہے اگر ہم بھی ان شیروں اور بھیڑیوں جیسے ہو جائیں تب تو ہم اپنے مذہب اور اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کر سکتے ہیں ورنہ ہم جہالت کے شکار ہو جائیں گے۔ ہم کو اپنے پاس پڑوس کی قوموں اور ان کے مذہب و تمدن کی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیے اور ان کی ترقیوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے ان قوموں کے عروج و ارتقاء کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان میں تعلیم کی روشنی پھیلی ہے اور وہ علوم و فنون کی عطا کی ہوئی قوتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہماری پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جس طرح بن پڑے ان علوم کو حاصل کریں اور ملک میں ان کی اشاعت کریں۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے اُن اثرات کا صاف پتہ چلتا ہے جو اس زمانہ میں محمد عبدہ کے خیالات و افکار کی تشکیل میں حصہ لے رہے تھے اور جن کی وجہ سے بعد میں انہیں ایک مصلح قوم کا مرتبہ حاصل ہوا۔ ان مضامین سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نوعمری میں وہ علامہ جمال الدین افغانی کے افکار و نظریات سے متاثر ہو چکے تھے اور خارجی دنیا سے ان کی بے تعلقی اور بیگانگی جس میں انہوں نے اپنی طالب علمی کا ابتدائی زمانہ بسر کیا تھا اب بالکل دور ہو گئی تھی۔

ان کے افکار و خیالات کے اس تدریجی ارتقاء کی جھلک ہمیں اُن کی دو تصنیفوں میں بھی نظر آتی ہے جو اس زمانہ میں شائع ہوئی تھیں۔ پہلی تصنیف الواردات ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی۔ بقول پروفیسر ہارٹن (PROF. HORTEN) یہ تصنیف جوش و خلوص اور فلسفہ آرائی سے لبریز ہے۔ ازہر کی تعلیم ابتدائے طالب علمی کے صوفیانہ تجربات اور جمال الدین افغانی کی صحبت و رفاقت سب کے سب اس تصنیف میں منعکس نظر آتے ہیں۔

ان کا فلسفیانہ طریق فکر اور تجدد پسندی خصوصیت کے ساتھ اُس تبدیلی پہ گواہ ہے جو علامہ جمال الدین

افغانی کی رفاقت نے ان میں پیدا کر دی تھی۔ تمہید میں وہ لکھتے ہیں کہ میں علم العقائد اور علم الکلام سے بیزار ہو چکا ہوں اور فرقہ بندی کے شکنجہ سے میں نے آزادی حاصل کر لی ہے۔ تاکہ ہر قسم کی قید اور طرح کی پابندی سے مجبور ہوئے بغیر شاہدِ علم کی جستجو کر سکوں۔ اس کتاب میں ان کے خیالات پر تصوف کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ اُن کے ذہن پر وجودیت (PANTHEISM) کا تسلط بھی صاف نظر آتا ہے۔ صوفیا کی طرح وہ بھی اِس اعتقاد پر زور دیتے ہیں کہ حقیقی وجود صرف خداوند تعالیٰ کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "خداوند تعالیٰ کے وجود کے سوا اور کوئی وجود حقیقی نہیں ہے اور نہ اس کی صفات کے علاوہ اور کوئی صفت وجود رکھتا ہے۔ اس لیے وجود اگر ہے تو بس اسی کا ہے باقی جو کچھ ہے عدمِ محض ہے" ہارٹن لکھتا ہے "بعض امور میں مثلاً خداوند تعالیٰ کی صفات کی نسبت ان کا یقین پختگی کو نہیں پہنچا ہے اور کہیں کہیں شک اور تذبذب کا چہرہ صاف نظر آجاتا ہے"۔

محمد عبدہ کی دوسری تصنیف جو ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی ایک جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب "العقائد العدودیہ" کی ایک[1] مشہور شرح کے مختلف حواشی کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں اُن اختلافات سے بحث کی گئی ہے جو مختلف فرقوں کے علماء میں مذہب کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں اس میں بتلایا گیا ہے کہ یہ اختلافات کہاں تک جزوی اور فروعی ہیں اور کس حد تک بنیادی اور اصولی۔ اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ان اختلافات کو مٹا کر ایسے عقائد و افکار کی تبلیغ کی جائے جو ہر فرقہ کے نزدیک قابل قبول ہوں۔

یہ موضوع تھا جسے اب محمد عبدہ نے اپنی تصنیف کے لیے منتخب کیا تھا۔ دو سال پہلے جو کتاب انہوں نے لکھی تھی وہ تصوف سے لبریز تھی۔ نئے موضوع سے اُس تبدیلی کا پتہ چلتا ہے جو اُن کی زندگی میں واقع ہوئی تھی۔ وہ خیالات جو اس کتاب میں ظاہر کیے گئے ہیں خصوصیت کے

---

[1] یہ کتاب علامہ جلال الدین الدوانی کی تصنیف ہے۔

ساتھ اس انقلاب حال کا ثبوت دیتے ہیں۔ کتاب کی ابتدا اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے
کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد میری اُمت بہتّر فرقوں میں منقسم
ہوجائے گی اور بجز ایک فرقہ کے باقی سب فرقے دوزخی ہوں گے۔ اس حدیث سے محمد عبدہ یہ
نتیجہ نکالتے ہیں کہ مختلف اسلامی فرقوں کو بڑی رواداری سے کام کرنا چاہیے۔ کیونکہ کوئی فرقہ
تیقّن کے ساتھ اس کا مدّعی نہیں ہوسکتا ہے کہ وہی نجات یافتہ ہے۔

ایک اور اہم نتیجہ وہ اس حدیث سے یہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ عقل ہی وہ رہنما ہے جو صداقت
تک رہبری کرسکتی ہے۔

اس طویل دور میں محمد عبدہ کے علم میں نمایاں ترقی ہوئی اور ان کا نقطہ نظر وسیع تر ہوگیا۔
اب ان کی مصروفیتیں اور دلچسپیاں بھی فکر و خیال کی دنیا سے نکل کر عملی جدوجہد پر مرکوز ہوگئیں
معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وقت زیادہ تر کتب خانہ ازھر کی کتابوں کی چھان بین میں صرف ہوتا تھا۔
اور اُن کو جامعہ کے لکچروں کی زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ محمد عبدہ اور علامہ جمال الدین افغانی کے
خلاف جامعہ کے اساتذہ اور معلّمین میں کافی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی علامہ
موصوف کی تجدد پسندی کو اور علم فلسفہ کے احیاء کے لیے اُن کی سرگرم مساعی کو جامعہ کے قدامت
پسند اساتذہ اور معلّمین اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے لیکن سیّد جمال الدین افغانی سے ان کی
نفرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ محمد عبدہ کی سرکردگی میں جامعہ ازھر کے طلباء ان کی علمی صحبتوں میں
شریک ہوکر جامعہ کی تعلیم سے غفلت کرنے لگے تھے۔ انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا
کہ وہ علامہ کے بتلائے ہوئے تحصیل علم کے نئے طریقوں سے خود مستفید ہوں۔ ان کی کوشش یہ
تھی کہ ازھر کے جو طلباء اُن سے امداد طلب کرنے آئیں انہیں بھی اس اصلاحی جدوجہد میں
شریک کرلیں اور حصول علم کے نئے طریقوں سے انہیں روشناس کریں۔ محمد عبدہ ان طلبائے

سامنے وہ مذہبی کتابیں بھی پڑھا کرتے تھے جن کی تعلیم اس زمانہ میں جامعہ ازہر میں نہیں ہوتی تھی۔ اسی قسم کی ایک کتاب "العقائد الرضائیہ" کی شرح تھی جو ان کو خاص طور سے پسند تھی۔ بعض طالب علموں نے شیخ الیش کو جو کہ قدامت پسندوں کے سرگروہ تھے یہ خبر پہنچائی کہ وہ معتزلہ کے عقائد کی اشاعت کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ الیش نے ان سے اس حرکت کا جواب طلب کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس چیز نے شیخ کو اتنا برافروختہ کر دیا تھا وہ یہ خیال تھا کہ ایک طالب علم کو یہ جرأت ہو جائے کہ وہ ایک ایسی مشکل کتاب کا درس دینے لگے جس کی تفہیم خود ازہر کے اساتذہ کے لیے خالی از دقت نہ تھی۔ چنانچہ شیخ نے محمد عبدُہ سے سوال کیا کیا تم نے اشاعرہ کے عقائد پر یقین کھو دیا ہے اور فرقہ معتزلہ کے عقائد پر ایمان لے آئے ہو؟ اس کا جو جواب محمد عبدُہ نے شیخ کو دیا اس نے شیخ کے غصہ کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ انہوں نے کہا اگر میں نے اشاعرہ کے عقائد وافکار پر بے سوچے سمجھے ایمان لانا چھوڑ دیا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں بغیر کسی ردّ وقدح کے معتزلہ کے عقائد قبول کر لوں۔ اصل یہ ہے کہ میں نے ہر قسم کی جامد تقلید ترک کر دی ہے اور ثبوت و دلائل کے بغیر میں کسی چیز پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

اس واقعہ نے جامعہ ازہر کے علمی حلقوں میں بہت برہمی پیدا کر دی اور اسی کے بعد سے اُن الزامات کی ابتدا ہوتی ہے جو سید جمال الدین افغانی اور محمد عبدُہ پر بعد میں لگائے گئے۔ اس برہمی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ محمد عبدُہ کو درس دینے کی ممانعت کر دی گئی جب مئی ۱۸۷۷ء میں ان کا امتحان ہو رہا تھا تو انہیں پہلی بار محسوس ہوا کہ سب ممتحنین ان کے خلاف ہیں۔ اور انہیں ناکام کر دینے کا عزم کر چکے ہیں۔ لیکن محمد عبدُہ نے امتحان میں ایسی غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ کیا کہ شیخ محمد العباسی کی حمایت سے ممتحنین کو انہیں کامیاب قرار دینا پڑا اگرچہ انہیں درجہ دوم میں کامیاب کیا گیا جو ان کی اعلیٰ قابلیت کے لحاظ سے

اُن کے لیے اہانت کا باعث تھا۔

جب محمد عبدُہ کو جامعہ ازھر سے سندِ علم مل گئی تو انہوں نے ازھر کو خیرباد کہا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ پھر ازھر واپس ہوئے اگرچہ اس مرتبہ وہ معلّم اور استاد کی حیثیت سے ازھر کی چار دیواری میں داخل ہوئے اب ان کی طالب علمی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور یوں تو وہ عمر بھر طالب علمی کرتے رہے جب وہ اپنی زندگی کے آخری منازل طے کر رہے تھے تو انہوں نے ایک مرتبہ کہا کہ "مَیں اب بھی طالب علم ہوں اور ہر روز اپنے علمی سرمایہ میں اضافہ کا خواہشمند رہتا ہوں"۔ اسی جذبہ کے ساتھ انہوں نے جامعہ ازھر میں اپنے نئے عہدہ کا کام شروع کیا اور یہ وہ کام تھا جس کے لیے انہوں نے تمام عمر تیاری کی تھی۔

پبلک لائف کی ابتدا

(۱۸۷۷ء تا ۱۸۸۲ء)

معلم اور اخبار نویس ایک مرتبہ جب محمد عبدہ پر ایک ایسی خدمت قبول کرنے کے لیے زور ڈالا جا رہا تھا جو ان کے مطبوع خاطر نہ تھی تو انہوں نے کہا تھا "میں معلمی کے سوا اور کسی کام کے لیے نہیں بنا ہوں"۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ کس طرح آئندہ زندگی میں ہر قسم کے اثر و رسوخ کو جو انہیں حاصل تھا انہوں نے اپنے خیالات کی اشاعت اور عوام الناس میں تعلیم کی روشنی پھیلانے کا ایک واسطہ بنا رکھا تھا تو ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اپنے متعلق وہ جو کچھ یقین رکھتے تھے وہ بالکل صحیح و درست تھا۔ اس کے علاوہ ایک مزید محرک جس نے انہیں طالب علمی کے بعد نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر آمادہ کیا تھا ان کی وہ تربیت تھی جو انہوں نے علامہ جمال الدین افغانی کی صحبتوں سے حاصل کی تھی اور قوم و مذہب کی خدمت کا وہ جذبہ تھا جو اس تربیت نے ان کے دل میں پیدا کر دیا تھا۔ اس لیے جب وہ دوبارہ جامعہ ازھر میں بحیثیت معلم داخل ہوئے تو نہایت گرم جوشی اور سرگرمی سے انہوں نے کام کی ابتدا کی۔ ازھر میں مختلف موضوعوں پر لکچر دینا شروع کیے اور مذہبی علوم کی تدریس میں انہوں نے منطقی استدلال و ثبوت کے وہ تمام طریقے استعمال کیے جو علامہ جمال الدین افغانی کے فیضانِ علم سے ان تک پہنچے تھے اس کے علاوہ گھر پر بھی وہ ان طلبا کے سامنے لکچر دیتے تھے جو ان کے پاس حصولِ علم کی

غرض سے آیا کرتے تھے ۔ اُن کے لکچروں کا ایک سلسلہ ابن مسکویہ کی تصنیف تہذیب الاخلاق پر تھا۔ سیاسیات کے لکچروں میں انہوں نے گوئیزٹ (GUIZOT) کی تصنیف "یورپ اور فرانس کی تمدنی تاریخ" (HISTORY OF CIVILIZATION IN EUROPE AND IN FRANCE) سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا۔ اس کتاب کا ترجمہ اسی زمانہ میں عربی میں ہوا تھا۔

۱۸۷۸ء کے ختم پر ریاض پاشا کے اثر سے محمد عبدُہ کو ایک مدرسہ میں جس کا نام دار العلوم تھا تاریخ کا معلّم مقرر کیا گیا۔ اس مدرسہ کے بانی خدیو اسماعیل کے وزیر تعلیم علی پاشا مبارک تھے۔ جامعہ ازھر کی اصلاح سے مایوسی کے بعد یہ مدرسہ اس غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ جدید طرز تعلیم کے ذریعہ یہاں سے روشن خیال اور وسیع النظر علمار تعلیم پا کر ملک میں پھیل جائیں۔ ان علوم کے علاوہ جن کی تعلیم جامعہ ازھر میں ہوتی تھی یہاں بعض جدید علوم کی تعلیم کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ یہاں آتے ہی محمد عبدُہ نے مقدمہ ابن خلدون پر لکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اس تصنیف کی تعلیم و تدریس ہی اہل مصر کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ محمد عبدُہ نے جو طریقہ تعلیم اختیار کیا وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور اس سے پہلے کانوں میں اس کی بھنک تک نہیں پڑی تھی۔ نوجوان معلّم نے اقوام و ملل کے عروج و زوال کے اسباب تمدن و معاشرت کے اصول اور عمرانی زندگی کی تنظیم کی بابت ابن خلدون کے خیالات پر بحث کرتے ہوئے سیاسی معاشرتی اور تمدنی امور کی نسبت اپنے خیالات و نظریات پیش کیے اور ان افکار و نظریات کو اپنے ملک کے حالات پر عملاً منطبق کر کے دکھایا۔

اسی زمانہ میں وہ خدیویہ مدرسۃ الالسنہ میں عربی زبان و ادب کے معلّم مقرر ہوئے اور اس عہدہ کا کام ازھر اور دار العلوم میں درس و تدریس کے کام کے ساتھ انجام دیا۔ عربی زبان و ادب کی تعلیم میں ان کی کوشش یہ رہی کہ صدیوں کے رائج شدہ ناقص طرز تعلیم کی اصلاح کریں۔ اپنے تمام

تعلیمی کاموں میں انہوں نے اصلاح کی اسپرٹ کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ ان کا بڑا مقصد یہ تھا کہ ملک میں نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو جائے جو عربی زبان اور اسلامی علوم کا احیاء کرے اور حکومت مصر کی گمراہیوں کی اصلاح کرے۔" حکومت مصر کی جانب اس اشارہ سے اہل مصر کی اُس بے چینی کا پتہ چلتا ہے جو اُس زمانہ میں حکومت وقت کے خلاف عام طور پھیلی ہوئی تھی اور جس کی وجہ یہ تھی کہ مالیاتی نظام کی درستگی کی کوشش میں مصری حکومت بیرونی اثرات کا شکار ہو رہی تھی۔ محمد عبدہ تعلیم کی اشاعت کو ان حالات کی اصلاح کا مؤثر ترین ذریعہ خیال کرتے تھے۔ ان جماعتوں میں جہاں وہ تعلیم دیتے تھے وہ ایک طرف تو کردار کی مضبوطی اور اخلاق کی درستگی پر خاص طور سے زور دیتے تھے۔ اور دوسری جانب وہ اس ضرورت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے کہ اہل ملک حکومت اور سیاست کے اصولوں کو سمجھیں اور ان میں عملی تربیت حاصل کریں۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ اپنے آئندہ کے کاموں کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

لیکن ان کی تعلیمی کوششوں کا سلسلہ یک بیک منقطع ہو گیا۔ ۲۵ جون ۱۸۷۹ء میں خدیو اسمٰعیل اپنے بیٹے توفیق پاشا کے حق میں تخت سلطنت سے دست بردار ہو گئے۔ توفیق پاشا کی ذات سے اصلاح و تجدد کی جو امیدیں ان کے وعدوں کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھیں اب غلط ثابت ہوئیں تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی اُس نے علامہ جمال الدین افغانی کے اخراج کا حکم صادر کیا اور محمد عبدہ کو دارالعلوم اور خدیویہ مدرسہ سے ہٹا کر اپنے آبائی قریہ محلات نصر میں گوشہ نشینی اختیار کرنے کا حکم دیا یہ واقعات ستمبر ۱۸۷۹ء میں پیش آئے۔ سید جمال الدین افغانی سے محمد عبدہ کا گہرا تعلق اور مذہب وسیاست میں ان کی وسیع النظری اور آزاد خیالی جو تعلیم و تدریس کے کام میں اُن سے ظاہر ہوئی تھی اُن کی مخالفت کا موجب بن گئی۔

جس وقت یہ کارروائی عمل میں آئی سابق وزیر ریاض پاشا ملک سے باہر تھے۔ جب وہ واپس ہوئے نومبر ۱۸۸۰ء میں انہوں نے محمد عبدہ کو الوقائع المصریہ کا ایک اڈیٹر مقرر کیا۔ یہ رسالہ اُس زمانہ میں حکومت مصر کا سرکاری ترجمان تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد انہیں اس رسالہ کا مدیر خاص مقرر کیا گیا اور یہ اجازت بھی دی گئی کہ وہ اُن اہل قلم حضرات میں سے بھی بعض کو اپنے کام میں شریک کرلیں جنہوں نے علامہ جمال الدین کے زیر تربیت اس کام میں مشق بہم پہنچائی تھی۔ یہ مددگار جنہیں محمد عبدہ کو اپنے ساتھ کام میں شریک کر لینے کی اجازت دی گئی تھی شیخ عدل کریم سلمان ان کے مدامی رفیق اور شیخ سعد زاغلول تھے جو اس زمانہ میں جامعہ ازہر میں طالب علم تھے اور بعد میں چل کر مصر کی تحریک آزادی کے سب سے بڑے قائد ہوئے تیسرے مددگار شیخ سعید وفا تھے۔

جس زمانہ میں محمد عبدہ الوقائع المصریہ کے مدیر خاص مقرر ہوئے اس وقت یہ رسالہ سرکاری اطلاعات محکمہ جات حکومت کے اعلانات اور مقامی حالات واخبار کی اشاعت کا ذریعہ تھا۔ نئے مدیر نے فوراً ہی اس کی اصلاح کی اور اس کے دائرہ عمل واثر کی توسیع کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے شعبہ اشاعت کے لیے ایک معین نظام نامہ مرتب کیا اور ریاض پاشا نے اُسے منظوری دے کر نافذ کیا۔ اس کے ذریعہ تمام سرکاری محکمہ جات کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے دفاتر کی جملہ اہم کارروائیوں فیصلہ جات تجاویز اور لائحہ عمل کا خلاصہ تیار کرکے اشاعت کے لیے روانہ کریں۔ مدیر خاص کو اختیار تھا کہ محکمہ جات کی ان ماہانہ کیفیات اور رپورٹوں میں جو چیز قابل اعتراض نظر آئے اس پر تنقید کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری عہدہ دار زیادہ احتیاط اور سرگرمی کے ساتھ اپنا کام انجام دینے لگے کیونکہ مدیر خاص کی تنقیدیں خود حکومت وقت کی نکتہ چینی کے مترادف تھیں۔ اس طرح نظم ونسق میں اصلاح کی ایک نئی راہ کھل گئی۔ مدیر خاص اپنے مددگاروں اور ماتحتوں پر اعلیٰ ادبی معیار کے برقرار رکھنے میں اس درجہ مُصر تھے کہ بعض بعض شرکاء کار اور ماتحت اس ضرورت

سے مجبور ہو کر شبینہ مدرسہ میں شریک ہو گئے۔ جسے محمد عبدہ نے مخصوص اسی غرض سے قائم کیا تھا اور جس میں وہ خود تعلیم دیتے تھے۔

شعبہ اشاعت کے اعلےٰ عہدہ دار کی حیثیت سے محمد عبدہ کو ملک میں شائع ہونے والے تمام اخبارات پر احتساب و نگرانی کا اختیار حاصل تھا خواہ یہ اخبار مصریوں کے ہاتھوں میں ہوں یا بیرونی اشخاص کے۔ اگر کسی اخبار میں حکومت کے کسی عہدہ دار پر تنقید کی جاتی یا اُسے موردالزام قرار دیا جاتا تو حکومت تحقیقات کے ذریعہ حقیقت حال معلوم کرتی تھی۔ اگر تنقید تلخ اور بے بنیاد ہوئی یا الزامات غلط نکلے تو اخبار کو تنبیہ کی جاتی۔ باوجود پیہم تنبیہوں کے اگر اخبار کی روش میں تبدیلی نہ ہوتی تو اس کو مسدود کر دیا جاتا تھا۔ عربی اخباروں کو حکم تھا کہ ان کا ادبی معیار ایک خاص سطح سے نیچے نہ اُترنے پائے اور ایک مرتبہ تو ایک عربی اخبار کو تنبیہ کی گئی کہ ایک معینہ مدت میں وہ اپنا ایڈیٹوریل اسٹاف بدل دے ورنہ اس کو مسدود کر دیا جائے گا۔ اس طرح سے محمد عبدہ نے مصر میں ادبی احیاء کی داغ بیل ڈالی۔

ابتدا ہی سے انہیں تعلیم سے خاص دلچسپی تھی اور ملک کی تعلیمی حالت کی بابت انہوں نے کئی ایک مضامین لکھے جن میں مدارس کے طریقہ تعلیم نظام العمل اور نصاب پر خوب جی کھول کر تنقیدیں کیں۔ اور محکمہ تعلیم کو خاص طور پر نشانہ ملامت بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳ مارچ ۱۸۸۱ء میں محکمہ تعلیم کی ایک مجلس اعلیٰ بنائی گئی اور اس مجلس کو مختلف عاملانہ اختیارات تفویض کیے گئے۔ محمد عبدہ بھی اس مجلس کے ایک رکن مقرر ہوئے۔ اُن کو اس مجلس کی ذیلی کمیٹی کا بھی رکن بنایا گیا جس کا قیام اس غرض سے عمل میں آیا تھا کہ وہ مدارس کے تعلیمی پروگرام کی جانچ پڑتال کرے اور اُس کی اصلاح کے لیے تجاویز پیش کرے۔ محکمہ وقف بھی محمد عبدہ کے مشوروں سے مستفید ہوتا رہا۔ ادھر انہیں دو محکموں پر کیا موقوف تھا قومی زندگی کا کون سا شعبہ اور نظم حکومت

کی کون سی شاخ تھی جو ان کی فیضان بخشی سے محروم رہی ہو۔

اگرچہ سرکاری حلقوں میں رسالہ الوقائع المصریہ کا اثر بہت نمایاں تھا لیکن محمد عبدہ اپنے رسالہ کے اس محدود دائرہ اثر پہ مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے ایک ادبی شعبہ بھی قائم کیا جس کے ذریعہ وہ اور ان کے شرکاء کار ایسے امور کی نسبت رائے زنی کرتے تھے جن کا تعلق عوام کی رائے اور اُن کی دلچسپیوں سے تھا۔ ملک میں اخباروں کی کمی نے رائے عامہ پہ اس شعبہ کے اثر و رسوخ میں اور اضافہ کر دیا۔ محمد رشید رضا نے محمد عبدہ کی سوانح عمری میں ان کے چھتیس[۳۶] مضامین نقل کیے ہیں جو قومی زندگی کے مختلف گوشوں سے متعلق ہیں۔ اور ان سے مصنّف کے اُس گہرے تردّد کا پتہ چلتا ہے جو انہیں اس اندیشہ کی وجہ سے پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں ایسے وقت جبکہ ہر طرف ترقی ترقی کی پکار ہو رہی تھی اور مغرب کی اندھی تقلید کا دَور دورہ تھا قومی نشو و ارتقاء کی عمارت کمزور اور ناپائیدار بنیادوں پہ نہ اُٹھائی جائے۔ ان مضامین میں بار بار تعلیم کے موضوع پہ بحث کرتے ہوئے وہ سرکاری مدارس پہ تنقیدوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک قوم کی قوم کو تہذیب و شائستگی اور علم و ترقی کی اعلیٰ سطح تک پہنچانا اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مغربی علوم کی تھوڑی بہت واقفیت سے یا اہل مغرب کے ادب معاشرت کی بے جان تقلید سے کوئی حقیقی انقلاب نہیں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ انہیں چیزوں کو ترقی کی علامت سمجھتے ہیں اُن میں مغرب کے رسم و رواج اُس کے تعیّشات و تکلفات اور اہل مغرب کے طرز معاشرت کی تقلید کا تباہ کن میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ قومی عظمت و وقار کی بازیابی یا شخصی عزت و اعتبار کے حصول کی راہ یہ نہیں ہے۔ قوم اُسی وقت ترقی کی حقیقی سطح تک پہنچ سکے گی جب افراد قوم میں کوئی بنیادی انقلاب رونما ہو۔ رسوم و رواج کی تبدیلی بتدریج ہونا چاہیے۔ سب سے بڑا قومی فرض یہ ہے کہ افراد کی سیرت و کردار اور ان کے

افکار و اعمال کی اصلاح کی جائے اس کے بغیر ہر قسم کی اصلاحی جد وجہد بیکار ہے لیکن اس عمل کے لیے ایک طویل مدت درکار ہے اور اس کا پہلا زینہ تعلیم کی اشاعت ہے۔

بچوں کے مذہبی عقائد پر تعلیم و تربیت کے اثرات سے کبھی وہ بحث کرتے ہیں اور والدین کو آگاہ کرتے ہیں کہ اپنی اولاد کو اُن مدارس میں نہ بھیجیں جن کا در و بست غیر مذاہب کے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ورنہ وہ یہ دیکھیں گے کہ بڑے ہو کر یہی بچے اپنے مذہب سے برگشتہ ہو جائیں گے اور اپنے معلّمین کے عقائد پر ایمان لے آئیں گے۔ یہ چیز بالکل ناگزیر ہے کہ بچپن کے اثر پذیر دورِ زندگی میں بچوں کے خیالات پر مذہبی تعلیم کا گہرا نقش جم جائے۔ اس لیے اگر ایسے لڑکے بڑے ہو کر اپنا مذہب تبدیل کر دیں تو اس کے ذمہ دار اُن کے والدین ہوں گے جو اس غفلت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ایک مضمون میں قوم کے اُن رسوم و رواج سے بحث کی گئی ہے جن میں اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔

رشوت ستانی کو مذموم بتلاتے ہوئے اس پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ لوگ معمولی معمولی کاموں کے لیے رشوت دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ شادی کو ایک فریضہ مذہبی قرار دیتے ہیں اور تعدّدِ ازدواج سے خاندانی زندگی میں جو تلخیاں اور ناگواریاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کی وجہ سے جو ناانصافیاں کی جاتی ہیں ان سب کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ شریعت اسلام نے ازواج کے مابین انصاف اور مساوات کا مطالبہ کر کے تعدّدِ ازدواج کو بہت محدود کر دیا ہے۔ ایک مضمون میں اُن رسوم کے ترک کرنے پر زور دیا گیا ہے جو حقیقی عبادت کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ ایک اور مضمون میں اسراف اور فضول خرچی کے نقائص پر بحث کی ہے اور اس معاملہ میں اعتدال سے کام لینے کی صلاح دی ہے۔

انہیں مضامین میں سے بعض میں سیاسی زندگی سے بحث کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ قومی فلاح

کے لیے قوانین ملک کا احترام ضروری ہے لیکن یہ قوانین حالات کے لحاظ سے بدلتے رہنے چاہییں اور عوام الناس کے فہم کے مطابق ہونے چاہییں۔ یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ نیابتی حکومت اور قوم کے حقیقی نمائندوں کے ذریعہ قانون سازی کا کام اسلامی حکومت کی نمایاں خصوصیت رہی ہے اگرچہ نمائندگی کی شکل اور طریق انتخاب کے متعلق اسلامی شریعت نے کوئی خاص ہدایت نہیں دی ہے بلکہ ان کو وقت و حالات کی تبدیلی کا تابع رکھا ہے تاکہ جو شکل یا جو طریقہ عامۃ الناس کے مفاد اور عدل و انصاف کے مقتضیات کے مطابق ہو وہ اختیار کیا جائے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک سے محبت کرے اور اس کی خدمت و حفاظت کے لیے کمربستہ رہے۔

الغرض جب محمد عبدہ کے اس دورِ زندگی پر ایک نگاہ بازگشت ڈالی جاتی ہے تو یہ عجیب و غریب منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کہ ازھر کا ایک شیخ جو مذہبی رہنماؤں علماء وقت اور ارباب سیاست سے کیا باعتبار خیالات و افکار اور کیا باعتبار اوضاع و اطوار اس قدر مختلف ہے عمامہ باندھے ہوئے مصر کے سرکاری اخبار کے ذریعہ ایک مطلق العنان حکومت کے رکن کی حیثیت سے اپنی جگہ بیٹھا ہوا حکام وقت کے اعمال پر تنقیدی نگاہیں ڈال رہا ہے ان کی کوششوں کو جانب اصلاح مائل کر رہا ہے۔ ملک کے اخباروں کے ادبی معیار کو بلند کر کے انہیں اہل ملک کے لیے مفید و سودمند بنا رہا ہے اور قوم کے اخلاق و عادات اور رسوم و رواج کی اصلاح میں مگن ہے۔

لیکن جس طرح اس سے قبل اُن کی تعلیمی سرگرمیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اسی طرح واقعات و حالات کی رفتار نے ان کے اس کام کو بھی ختم کر دیا۔ مئی ۱۸۸۲ء میں اٹھارہ مہینے کام کرنے کے بعد رسالہ الوقائع المصریہ سے ان کا تعلق ٹوٹ گیا۔ اُس وقت مصر کی قومی تحریک جو محمد عربی پاشا کے نام کے ساتھ وابستہ ہے بہت زور شور سے جاری تھی فوج کے ترکی عہدہ داروں کے ساتھ جو امتیازی سلوک کیا جاتا تھا وہ اس تحریک کے پیدا کرنے کا موجب ہوا تھا۔ مگر بعد میں اس نے

وسعت پاکر ہر قسم کے بیرونی اثرات کے خلاف ایک جدوجہد کی صورت اختیار کرلی۔ عربی پاشا جنہیں ابتداً فوج میں کرنل مقرر کیا گیا تھا اور جو بمدارج ترقی کرکے بالآخر ۴ر فروری ۱۸۸۲ء کو محمود سمیع پاشا کی کابینہ کے وزیر فوج مقرر ہوئے اس تحریک کے مقبول عام لیڈر تھے۔ جب ۲۶ رمئی کو اس وزارت نے استعفاء دے دیا تو نئی کابینہ میں عربی پاشا کو دوبارہ وزیر فوج کی حیثیت سے شریک کرنا ضروری خیال کیا گیا۔ لیکن واقعات وحوادث نے قومی آزادی کی امیدوں پہ پانی پھیر دیا۔ گیارہ جون کو اسکندریہ میں زبردست فسادات رونما ہوئے اور اس کے بعد گیارہ جولائی کو انگریزی بحری بیڑے نے اسکندریہ کی بندرگاہ اور قلعہ پہ بم باری کی اور ۱۳ ستمبر کو طلل الکبیر پہ مصری فوج کی شکست اور دو دن بعد عربی پاشا کی گرفتاری نے قومی تحریک کا خاتمہ کردیا۔ اس کے بعد فوجی لیڈروں پہ مقدمہ چلا کر انہیں سزا دلوائی گئی۔ عربی پاشا کو موت کی سزا کا فیصلہ سنایا گیا لیکن بعد میں یہ سزا جلاوطنی میں تبدیل کر دی گئی۔

جس زمانہ میں محمد عبدُہ الوقائع المصریہ کے مدیر خاص تھے اسی زمانہ میں عربی پاشا کی قیادت میں مصر کی قومی تحریک عروج پہ تھی۔ یہ ناگزیر تھا کہ محمد عبدُہ جو ترقی پسند عناصر کے روح رواں تھے اور نیابتی ادارہ جات کے قیام کو اسلامی ممالک کے لیے نہ صرف مناسب بلکہ ضروری خیال کرتے تھے اور بیرونی اثرات کے مٹانے کے درپے تھے اس تحریک میں تھوڑا بہت حصہ لیں جو بقول لارڈ کرومر (LORD CROMER) بعض خصوصیات کے لحاظ سے حقیقتاً قومی تحریک کہلائی جا سکتی تھی۔

مذکورہ بالا تحریک کے ابتدائی زمانہ میں جس وقت تک فوجی لیڈروں نے اپنے مقاصد کے لیے تشدد کا حربہ استعمال نہیں کیا تھا محمد عبدُہ کا خیال تھا کہ اُن وسیع اصلاحی تدابیر و تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آگیا ہے۔ جن کا نقشہ ایک زمانہ سے اُن کے ذہن میں بنا بنایا تیار تھا۔ ان کا یہ بھی ارادہ تھا کہ وہ اس تحریک کو بیرونی طاقتوں کے شکنجہ سے ملک کو رہائی دلانے کی کوششوں

کا ابتدائی زینہ بنائیں۔ اس وقت تک وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس تحریک کے رہنما شخصی اغراض سے پاک ہیں اور انصاف و مساوات کے حصول کے لیے اصلاحی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس لیے انہوں نے دل و جان سے اس تحریک کی رہنمائی کرنا شروع کی اور اس کے لیڈروں کو صلاح و مشورہ دینے میں کوئی کمی نہ کی یہاں تک کہ انہیں اس کی پرواہ بھی نہ رہی کہ کوئی ان کے مشوروں پر کان دھرتا بھی ہے یا نہیں۔

الوقائع المصریہ کے مدیر خاص اور محکمہ احتساب کے صدر کی حیثیت سے جو مواقع انہیں حاصل تھے اُن کو انھوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ایک مضبوط اور صحیح رائے عامہ پیدا کریں اور قومی تحریک کے علمبرداروں کو اعلیٰ مقاصد سے روشناس کریں۔ دوسری طرف عربی پاشا اور دوسرے لیڈر جو ان کے گروہ میں شامل تھے محمد عبدہ کو اپنا معلّم اور فکری رہنما خیال کرتے تھے۔ ان کی موجودگی میں ان سب لیڈروں نے ملک کی سچی بھی خواہی اور وفاداری کا حلف اُٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ ندیم اور دیگر اشخاص کے ساتھ انہیں بھی انقلابی جماعت کا سرغنہ سمجھ لیا گیا۔ اُن کی وفات کے بعد جو بیانات ملک کے اخباروں میں شائع ہوئے اُن سب میں اس انقلابی تحریک کے ساتھ ان کے تعلق کا اظہار کیا گیا ہے اکثر اخباروں نے اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا کہ عربی پاشا اور ان کے متبعین محمد عبدہ کے مشورہ بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھاتے تھے۔

اگرچہ قومی تحریک پر محمد عبدہ کے اثر و نفوذ اور ان کی عام قائدانہ حیثیت مسلّم ہے لیکن بے انصافی ہوگی اگر یہ بھی ساتھ ساتھ نہ بتا دیا جائے کہ اکثر امور کی نسبت وہ فوجی لیڈروں سے اختلاف رکھتے تھے اور جوں جوں قومی تحریک کی رفتارِ ترقی بڑھتی گئی ان کے خیالات و مقاصد اور فوجی لیڈروں کے فکر و عمل میں جو اختلاف ابتدائے کار سے موجود تھا روز بروز اور نمایاں ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ مجبوراً انہیں اپنی تحریروں میں قومی تحریک کے رہنماؤں پر تنقید کرنی پڑی۔ انہیں نہ تو اُن رہنماؤں

کے طریق عمل اور خصوصاً ان کے تشدد آمیز رویہ سے اتفاق تھا اور نہ ان بڑی بڑی توقعات میں شریک تھے جو ان لیڈروں نے اپنی تحریک کے نتائج کی نسبت قائم کر رکھی تھیں۔ محمد رشید رضا نے ان کی پوزیشن بالکل واضح کر دی ہے:۔

"فوجی تحریک کے فکری اور ادبی پہلو کے بانی مبانی اور اس کے روح رواں ہونے کے باوجود وہ فوجی انقلاب کے سخت ترین مخالف تھے۔ انقلاب اور اس کے حامیوں سے انہیں تنفر تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انقلاب کی وجہ سے وہ کام ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا جس کا آغاز انہوں نے کیا تھا حکومت کے پیش نظر جو اصلاحی تجاویز تھیں انقلاب کی وجہ سے ان کو روبعمل لانا ناممکن ہو جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بیرونی طاقتوں کی مداخلت کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی انقلابی گروہ کے طریقۂ عمل پر ان کی بے خوف تنقیدوں کی وجہ سے انہیں اکثر اوقات دھمکیاں بھی دی گئیں مگر وہ اپنی راہ پر ثابت قدم رہے۔

طٰہٰ پاشا کے مکان پر محمد عبدہ عربی پاشا اور فوجی لیڈروں کے مابین جو گفتگو ہوئی تھی اس سے نظریات کا یہ اختلاف صاف ظاہر ہوتا ہے۔

عربی پاشا اور ان کے ساتھی اس خیال پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے کہ دستوری حکومت ملک کے مفاد کے لیے قطعی ضروری ہے۔ اور مصر میں اس قسم کی حکومت کے قیام کا وقت آ گیا ہے۔ محمد عبدہ اس کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سب سے پہلے اہل ملک کو اس طرز حکومت کے لیے ضروری تعلیم و تربیت دی جانی چاہیے تاکہ ایسے افراد کافی تعداد میں پیدا ہو جائیں جو اس قسم کی حکومت کو ہوشمندی اور ثابت قدمی کے ساتھ چلا سکیں۔ مرکز اور صوبوں میں نیابتی مجلسوں کے ساتھ کام کرنے کی عادت حکومت اور اہل ملک دونوں کو ہونی چاہیے۔ جس بار کو اٹھانے کے لیے افراد قوم تیار نہیں ہیں اسی سے ان کے کمزور شانوں کو گرانبار کر دینا دانشمندی کے خلاف ہوگا۔ اس کی مثال بالکل ایسی

ہو گی کہ کسی نابالغ لڑکے کو اس کے ماں باپ کا سارا جمع جتھا دے دیا جائے قبل اس کے کہ اس میں اِس مال و دولت کو صحیح طور سے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ ان حالات میں تشدّد اور انقلاب کے ذریعہ حکومت میں تبدیلی کرنے کی کوشش کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ بیرونی طاقتیں ملک پر قابض ہو جائیں۔ ایک مرتبہ نہیں کئی بار محمد عبدہ نے عربی پاشا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اعتدال پسندی اور میانہ روی سے تھوڑے ہی عرصہ میں انہیں وہ سب کچھ حاصل ہو جائے گا جس کے وہ خواہشمند ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر جب قومی تحریک کے لیڈروں کے ایک جلسہ کو مخاطب کرنے کی انہیں دعوت دی گئی تو انہوں نے تاریخی شواہد پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ جب کبھی کوئی انقلابی تحریک مطلق العنان حکومتوں کے بے قید اختیارات کو محدود کرنے اور حکمرانوں سے حقوق مساوات و نمائندگی بجبر چھین لینے میں کامیاب ہوئی تو یہ تحریک ہمیشہ قوم کے متوسط اور ادنیٰ طبقات سے شروع ہوئی اور اسی وقت سرسبز ہو سکی جب سیاسی تعلیم و تربیت کے ذریعہ ایک مضبوط رائے عامہ تشکیل پذیر ہو چکی تھی۔ یہ کبھی نہیں ہوا ہے کہ دولت مند معزز اور با اثر طبقے کے لوگوں نے غریب عوام الناس کے ساتھ مساوات قائم کی ہو اور انہیں دولت اور حکومت میں حصہ دار بنایا ہو۔ انہوں نے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کیا تم نے خدا کے بنائے ہوئے قانون کو بدل دیا ہے یا نظام عمرانی کی فطری ترتیب الٹ گئی ہے۔ کیا تمہارے درمیان نیکی اور راست کرداری اس درجہ کمال کو پہنچ گئی جہاں تک وہ اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچی تھی اور تم نے برضا و رغبت اور خوب سوچ سمجھ کر اپنے حاصل کیے ہوئے اقتدار اور اپنی فتح مندیوں کے نتائج میں قوم کے دیگر تمام افراد کو حصہ دار بنا لیا ہے اور انصاف اور خدمت خلق کے جذبات سے سرشار ہو کر تم غربا اور مساکین کو آپ برابر کا سمجھنے لگے ہو یا ایسا نہیں ہے اور تم اندھوں کی طرح ایک آن دیکھے اور بے جانے بوجھے راستہ پر چلے جا رہے ہو اور

جو کچھ کر رہے ہو اُس کے نتائج سے لاعلم ہو۔" وہ خود جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے دستوری حکومت کے بڑے حامیوں میں سے تھے۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ اس قسم کی حکومت حاکم اور محکوم بادشاہ اور رعایا میں باہمی مفاہمت کے ذریعہ قائم کی جانی چاہیے نہ کہ بغاوت اور انقلاب کے ذریعہ اور اس کی ابتدا ایسی ہونی چاہیے کہ اہل ملک بتدریج اس حکومت کے مقتضیات کو سمجھ سکیں اور نیابتی ادارہ جات کا صحیح استعمال سیکھ جائیں تا آنکہ ایک نئی پود وجود میں آجائے جو حکومت کا بار سنبھالنے کی اہلیت رکھتی ہو

لیکن جب واقعات کی رفتار نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ قومی تحریک کی ہمنوائی یا خدیو مصر کی اعانت (جو درحقیقت بیرونی طاقتوں کی اعانت کے مترادف ہوتی) میں سے کسی ایک کو ترجیح دیں تو انہوں نے قومی تحریک کے علمبرداروں کا ساتھ دینا بہتر خیال کیا اگرچہ وہ اس تحریک کے نتائج سے خائف ضرور تھے۔ جب یہ تحریک ناکام ہوئی تو دوسرے لیڈروں کے ساتھ ساتھ ان پر بھی مقدمہ چلایا گیا اور تین سال تین ماہ کے لیے انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ ان کو یہ حکم بھی تھا کہ حکومت مصر کی اجازت کے بغیر وہ ملک میں قدم نہ رکھیں۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء کے ختم سے قبل ہی انہوں نے سرزمین مصر کو الوداع کہا اور شام کی طرف روانہ ہوئے تاکہ وہاں اپنے لیے کوئی مامن تلاش کریں۔

اس طرح ملک کی ترقی اور بیداری کے لیے ان کی اولین کوشش ناکام رہی اور اس ناکامی کی تلخیوں کو جس واقعہ نے تلخ تر بنا دیا وہ اُن کے دوستوں کی بے وفائی تھی جن پر انہوں نے اعتماد کیا تھا اور جنہوں نے بعد میں ان کی مخالفت میں اُن پر طرح طرح کے الزامات تراشے۔ لیکن جن بلند توقعات اور تمناؤں کے ساتھ انہوں نے کام کی ابتدا کی تھی وہ بالکل برباد نہیں ہوئی تھیں۔ مقدمہ کے دوران میں وہ قید خانہ سے اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں "یہ تکلیف دہ اور روح فرسا واقعات کبھی نہ کبھی لوگوں کے حافظہ سے محو ہو جائیں گے اور قومی عزت و وقار کی مسمار شدہ عمارت پھر کبھی نہ کبھی ضرور تعمیر ہو جائے گی لیکن اگر اہل ملک کی پست حالت ان کی غفلت اور نادانی کی وجہ

سے اس ملک کو عزت و وقار کی گمشدہ دولت حاصل نہ ہو سکی تو پھر ہمیں رنج نہ ہونا چاہیے اگر دوسرے ممالک اس دولت کے مالک ہو جائیں ۔ اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں ہمیشہ اس بات کی کوشش کروں گا کہ میں اپنے دوستوں یا اور لوگوں کو جو اس طرف آنا چاہیں نیکی سچائی اور شرافت کی طرف دعوت دوں ۔ مگر یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے جب میری صحت اس کام کی اجازت دے اس کے علاوہ میری اور کوئی خواہش نہیں ہے بجز اس کے کہ خداوند تعالیٰ کی مدد میرے شامل حال ہو۔

جلاوطنی کی زندگی ۱۸۸۲ء تا ۱۸۸۸ء

جب ۱۸۸۲ء کے اواخر میں محمد عبدُہ نے وطن کو خدا حافظ کہا تو ان کا ارادہ تھا کہ وہ شام چلے جائیں اور وہاں اُس وقت تک سکونت اختیار کریں جب تک کہ انہیں مصر واپس آنے کی اجازت نہ مل جائے لیکن بیروت میں ایک سال قیام کرنے کے بعد سید جمال الدین افغانی نے جو ۱۸۸۳ء کے آغاز سے پیرس میں سکونت پذیر تھے انہیں دعوت دی کہ وہ وہاں آ کر مسئلہ مصر کے متعلق ان کے کام میں ہاتھ بٹائیں ۔ اس لیے ۱۸۸۴ء کے اوائل میں وہ بیروت سے رخصت ہو کر اپنے قدیم معلّم اور رہنما سے پیرس میں آملے ۔ وہاں وہ تقریباً دس ماہ تک رہے اور اس درمیان میں صرف ایک مرتبہ انگلستان اس غرض سے گئے کہ وہاں جا کر ارباب حکومت اور وزراء سے مصر اور سوڈان کے معاملات پر گفت و شنید کریں جہاں اس وقت مہدی سوڈانی کی فوج کشی کی وجہ سے حالات بہت نازک ہو گئے تھے ۔ اس زمانہ میں یہ دو دوست جو شاگرد اور استاد بھی تھے ایک خفیہ انجمن العروۃ الوثقیٰ کے معاملات کی درستگی میں مصروف تھے ۔ اس انجمن کی بنیاد بھی انہیں دونوں نے ڈالی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی ممالک میں بیداری پیدا کی جائے اور ان ممالک کی رائے عامہ کو منظم کیا جائے ۔ انہوں نے ایک رسالہ جس کا نام بھی عُروۃ الوثقیٰ تھا شائع کرنا شروع کیا تھا ۔ تاکہ اس کے ذریعہ اپنے خیالات و نظریات کی اشاعت کریں ۔ جب اس رسالہ کو مسدود کر دیا گیا تو یہ دونوں دوست جُدا ہو گئے سید جمال الدین افغانی روس چلے گئے اور

محمد عبدہ ٹیونس روانہ ہوگئے جہاں چند دنوں قیام کے بعد اپنی انجمن کی تنظیم کو مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے بھیس بدل کر کئی ایک ملکوں کا سفر کیا۔

اتنی مختصر سی مدت میں العروۃ الوثقیٰ کو جو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اُس کے سمجھنے کے لیے ہمیں ان خیالات و افکار پر ایک نظر ڈالنی چاہیے جو اُس کے صفحات میں بتکرار پیش کیے جاتے تھے مسلمانوں کے زوال و انحطاط پہ ماتم کرتے ہوئے اُن سے اپیل کی جاتی تھی کہ وہ اپنے مذہب کی مشترکہ اساس پر متحد ہو جائیں اور اپنے مطلق العنان حکمرانوں اور بیرونی طاقتوں کے مقابلہ پہ کمر بستہ ہو جائیں تاکہ اسلام کی گمشدہ عظمت و شوکت پھر بحال ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی دعوت کے اثرات نے بہت جلد ان لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع کیا جو مسلمانوں کی پسماندگی اور زبون حالی کا احساس رکھتے تھے۔ پھر یہ مضامین جو العروۃ الوثقیٰ کے صفحات کی زینت تھے عربی زبان کی فصاحت وبلاغت کا کامل ترین نمونہ تھے۔ ذیل میں مجملاً ان خیالات کو پیش کیا جاتا ہے۔

مذہب اسلام ایک ایسا رشتہ ہے جو اقطاع عالم کے مسلمانوں کو ایک وحدت عطا کرتا ہے اور ان میں سے نسلی اور قومی امتیازات مٹا دیتا ہے۔ اسلامی شریعت راعی اور رعایا کے تعلقات بتفصیل متعین کرتی ہے اور جسم اسلام کے مختلف اعضا میں تعاون کے امکانات بڑھاتی اور منافقت کے مواقع دور کرتی ہے۔ دوسرے مذاہب کے برخلاف اسلام صرف آخرت کی زندگی ہی کے لیے رہنمائی نہیں کرتا ہے بلکہ اس موجود اور مادی دنیا کے پیچیدہ مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے اور اس طرح اپنے پیرووں کو دنیا اور آخرت دونوں کی سعادتوں سے بہرہ اندوز کرتا ہے۔

مسلمانان عالم ایک زمانہ تک ایک واحد سلطنت کے زیر فرمان متحد اور متفق تھے۔ علوم و فنون کی ہر شاخ میں ان کے کمالات آج تک صفحہ ہستی پر نقش ہیں۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہر اُس ملک میں جہاں اسلام کے حلقہ بگوش موجود ہیں اسلامی اقتدار کی بقاء اور اسلامی حکومت

کے قیام کے لیے ساعی رہیں۔ اور کسی حالت میں بھی ان کے لیے یہ جائز نہیں رکھا گیا ہے کہ وہ اُن لوگوں سے مصالحت کریں جنہوں نے ان کے ملکوں پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے اقتدار کو غصب کر لیا ہے۔ اُن پر تو مذہباً فرض ہے کہ وہ کسی قسم کی مداہنت بغیر ایسی تمام طاقتوں کے خلاف تلوار اُٹھائیں اور اُس وقت تک دم نہ لیں جب تک کہ انہیں ہٹا کر اپنا قبضہ و اقتدار دوبارہ قائم نہ کر لیں۔ لیکن مسلمان بادشاہوں اور فرمانرواؤں کی حرص و آز کی وجہ سے مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق رخصت ہو گیا ہے۔ ان بادشاہوں اور حکمرانوں کی تعیش پسندی اسباب زینت کی چاٹ اور ظاہری شان و شوکت کے شوق نے ملّتِ اسلامیہ کو زوال و انحطاط کے آخری درجہ پہ پہنچا دیا ہے مسلمانوں کو جن رشتوں نے ایک مضبوط اتحاد میں کس دیا تھا وہ اس وقت سے کمزور ہونے لگے جب عباسی خلفاء میں سے علم و فضل قوتِ اجتہاد اور سچی مذہبیت کا جوش جاتا رہا اور وہ صرف خلیفہ کے لقب سے ملقّب ہونے کو اپنی معراج سمجھنے لگے۔

اس طرح سے تیسری صدی ہجری کے بعد سے فرقہ پرستی اور گروہ بندی کا دور دورہ ہو گیا اور خود خلافت میں تفرقہ پڑ گیا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان فرمانروا اور بادشاہ اسلامی حکومتوں میں بیرونی اثرات کی مداخلت کو نہ صرف گوارا کرتے ہیں بلکہ خود اپنی گردنوں میں غیر ملکی حکومتوں کی رسیاں ڈالنے میں مصروف ہیں یوروپین قومیں جو اسلامی ممالک کے لیے ایک عرصہ سے حریص ہیں اور مسلمانوں کی وحدت کو توڑنے کے مواقع ڈھونڈھتی ہیں اسلامی حکومتوں کے باہمی نزاعات اور جھگڑوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ بیرونی اشخاص کو اسلامی حکومتوں نے بڑے بڑے عہدے دے رکھے ہیں یہ لوگ جو اسلام سے بیگانہ بلکہ اس کے دشمن ہیں نہ تو حکومت کی عزت و وقار کے لیے تڑپ رکھتے ہیں اور نہ عوام الناس کی بہبودی اور خوشحالی کے لیے حسّاس دل رکھتے ہیں انہیں تو صرف اپنی تنخواہ سے واسطہ ہے اور وہ صرف اپنے فائدہ کے جویاں ہیں۔ اسلامی حکومتیں آج ایک دوسرے

کی امداد سے ہاتھ اُٹھا چکی ہیں کیونکہ انہیں ایک دوسرے کے حالات ہی کا علم نہیں ہے۔ علماء جن کا کام تھا کہ وہ مسجدوں اور مدرسوں کو اس گم شدہ وحدت و اتفاق کے قیام کا مرکز بنائیں اپنے پُرانے طریق عمل کو فراموش کر چکے ہیں۔ جو کبھی اتفاق و اتحاد پیدا کرنے میں سب سے زیادہ موثر اور کارگر تھا۔ نہ وہ دوسرے ممالک کے علماء سے سلسلہ رسل و مراسلت رکھتے ہیں نہ باہمد گر ملاقاتوں کے لیے سفر کی زحمت اُٹھاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حال سے بے خبر ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ امراء اور بادشاہوں نے انہیں اپنی ہوا و ہوس کا غلام بنا رکھا ہے۔ اس لیے ان میں سے رائے کی آزادی اور اجتہاد کی جرأت مفقود ہو گئی ہے۔

اسلامی ممالک کے زوال و انحطاط کا علاج یہ نہیں ہے کہ اخبارات کی تعداد بڑھا دی جائے یا یورپین مدارس کے نمونہ پر ملک میں بکثرت مدارس کھول دیئے جائیں کیونکہ ان مدارس اور ان میں سکھائے جانے والے علوم کے ذریعہ بیرونی اثرات کی مداخلت کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا ہے نہ ہی اس کی تدبیر یہ ہے کہ مغربی طرز کی تعلیم دی جائے اور مغربی معاشرت کی تقلید کی جائے کیونکہ تقلید کی وجہ سے قوم کی روح مردہ ہو جاتی ہے اور جن کی تقلید کی جاتی ہے ان کا اثر و اقتدار ملک پر بڑھتا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ادبار کا حقیقی علاج ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر سچائی کے ساتھ کاربند ہو جائیں اور خلفاء راشدین کے زمانہ کی اسپرٹ پھر زندہ کر لیں۔ اگر وہ اپنی موجودہ گری ہوئی حالت سے نکل آئیں اور اپنے سچے مذہب کے اصولوں پر خلوص دل اور سرگرمی کے ساتھ عمل کرنا شروع کر دیں تو وہ انسانیت کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ سکتے ہیں اسلامی ممالک کو باہمی امداد کا سبق سیکھنا چاہیے اور دشمن کے سامنے متحد ہو جانا چاہیے۔ اس سے یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ ان سب ممالک پر ایک شخص واحد حکمران ہو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کلام الٰہی کو تمام اسلامی دنیا پر اثر و اقتدار حاصل ہو اور وہی مسلمانوں کی تمام نزاعوں اور جھگڑوں میں

حکم تسلیم کیا جائے مسلمانوں کو ایک رشتہ میں باندھنے والی اور ایک وحدت میں پرو دینے والی قوت ان کا مذہب ہو اور ایک اسلامی حکومت دوسری اسلامی حکومت کی حفاظت و اعانت کے لیے اپنے تئیں ذمہ دار گردانے۔ کیونکہ ہر اسلامی ملک کی زندگی اور بقا، دوسرے اسلامی ممالک کی زندگی اور بقا پر منحصر ہے جب کبھی مسلمانوں کے کسی ملک پر کوئی ظالم اور ناحق شناس حکمران مسلط ہو جائے اور اپنے اعمال و کردار سے ملک کو مصیبت اور بربادی کی طرف لے جا رہا ہو تو خواہ وہ حکمران مسلمان ہی کیوں نہ ہو اُس ملک کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اُس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور اُسے نکال باہر کریں کہ مبادا اس کے عمل اور مثال سے کبھی روگ جسم اسلام کے دوسرے اعضا میں سرایت کر جائے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسالہ العروۃ الوثقیٰ کا لہجہ اور اس کی اسپرٹ اُن خیالات سے کہیں زیادہ انتہا پسند اور انقلاب انگیز ہے جن کا اظہار محمد عبدہ مصر میں الوقائع المصریہ کے صفحات پر کیا کرتے تھے۔ اس لیے جائے حیرت نہیں ہے کہ اسلامی ممالک کے حکمران اور اعلیٰ سرکاری عہدہ دار اس رسالہ کی اشاعت سے خوفزدہ ہو کر اسے بند کر دینے پر آمادہ ہو گئے اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ اس رسالہ کے غیر معتدل میلانات اور اس کے تلخ لہجہ کی ایک وجہ وہ ناکامی اور شکست تھی جو حال ہی میں ترقی پسند عناصر کو مصر میں اُٹھانا پڑی تھی اور جس کی وجہ سے بیرونی طاقتوں کے اشارہ پر اور مسلم ارباب اقتدار کی انفعالیت سے جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کو جلاوطن ہونا پڑا۔ لیکن اس کا حقیقی سبب یہ تھا کہ اس پوری مدت میں علامہ جمال الدین کی شخصیت محمد عبدہ پر پوری طرح سے چھائی ہوئی تھی۔ علامہ موصوف فطرتاً انقلابی تھے اور محمد عبدہ خلقی طور سے اعتدال پسند اور تدریجی اصلاح کے قائل تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مرتبہ خود محمد عبدہ نے اس پر رضامندی ظاہر کی تھی کہ مصر کی آزادی کی خاطر اس کا حکمران تہ تیغ کر دیا جائے لیکن اُس وقت بھی علامہ جمال الدین کا اثر اُن پر

غالب تھا کیونکہ اس وقت تک علامہ مصر ہی میں اقامت پذیر تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ العروۃ الوثقی کی مسدودی اور علامہ جمال الدین سے جدائی کے دو سال بعد ان کی دو تحریروں سے جن میں ایک کے مخاطب قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام اور دوسری کے مخاطب والیے بیروت تھے اتحاد اسلامی کی اسپرٹ عیاں ہے کیونکہ ان دو تحریروں میں انہوں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ دولت عثمانیہ کے تحفظ و بقاء کی ضرورت پر ایمان خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے کے بعد اسلامی عقائد میں سب سے زیادہ اہم ہے لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اسلامی خلافت کی صیانت کا خیال ان کے جذبہ مذہبی کے سوا اور کسی جذبہ سے ماخوذ تھا۔ سیاسی مصالح یا خود اپنے ملک کا فائدہ اس تعاون کا سرچشمہ نہ تھا۔ بیرونی اثرات کی مخالفت اور بیرونی طاقتوں سے تنفر ان الفاظ سے بھی ظاہر ہے جو انہوں نے امریکہ انگلستان اور فرانس کے متعلق استعمال کیے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی ممالک میں یوروپین اور امریکی مدارس اور تعلیم گاہیں قائم کر کے یہ تینوں مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن درحقیقت اسلام کے مٹانے کے درپے ہیں۔

لیکن ان کی پوری زندگی پر ایک مجموعی نظر ڈالنے اور ان کی تصانیف و تقاریر کے عام رجحانات کو دیکھنے سے اس بات کا ناقابل تردید ثبوت حاصل ہو جاتا ہے کہ ان کی حیثیت مقدماً ایک مصلح کی تھی اور وہ تعلیم کی اشاعت اور اخلاق کی تربیت کو انقلاب اور شورش سے زیادہ کارگر متصور کرتے تھے۔ اگر عربی پاشا کی قومی تحریک کے آخری دور میں وہ انقلابیوں میں جا ملے تو اس کی وجہ جیسا کہ انہوں نے خود بیان کیا ہے یہ تھی کہ حالات نے اس تحریک کی حمایت پر انہیں مجبور کر دیا اور نتیجۃً انہیں اس طریق کار کو بھی قبول کرنا پڑا جس کی سودمندی پر انہیں بالکل یقین نہ تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ وہی مقاصد زیادہ تیقن کے ساتھ گو بہ نسبتاً دیر میں کسی قسم کا شور و شر کیے بغیر تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں۔ محمد رشید رضا لکھتے ہیں "محمد عبدہ اور ان کے معلم اور پیشوا علامہ جمال الدین افغانی کو مصر میں توفیق پاشا کے دور میں جو تجربات حاصل ہوئے انہوں نے دستوری اور سیاسی اصلاح کے متعلق ان کی امیدوں پر کاری ضرب لگائی۔

اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ اصلاح حال کی جانب انہیں متوجہ کیا"۔ اسی لیے پیرس میں انہوں نے علامہ جمال الدین افغانی کے سامنے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اصلاح کا سیاسی طریق عمل کامیاب نہیں ہوگا۔ کیونکہ صرف بیرونی طاقتوں کے اثرات اور ان کی مداخلت سے آزادی حاصل کر لینا ہی ایک انصاف پسند اور معدلت شعار اسلامی حکومت کے قیام پر منتج نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا بہتر ہوگا کہ ہم دونوں کسی دور دراز گوشہ میں سیاسی زندگی کے زیر و بم سے دور تعلیم و تربیت کے ذریعہ نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کریں جو کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہر طرف پھیل جائے اور اپنی جدوجہد اور اصلاحی کوششوں سے اپنی ہی جیسی جماعتیں تیار کرے۔ اس طرح بہت تھوڑے عرصہ میں ہمارے تربیت یافتہ نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد دنیا کے ہر حصہ میں اُن مقاصد کے لیے جدوجہد کر رہی ہوگی جو آج ہمارے پیش نظر ہیں۔ لیکن علامہ جمال الدین افغانی نے یہ تجویز مسترد کر دی اور کہا کہ ہم کو اسی راہ میں ثابت قدم رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ یا تو ہم کامیابی سے ہمکنار ہوں یا ناکامی سے داغدار۔

اپنی سوانح عمری میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ میں میں نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دے لیا تھا کہ مصر کے حکمرانوں کے خلاف اہل مصر کے حقوق کی حمایت کروں۔ یہاں بھی وہ دراصل اپنی زندگی کے اُس دور کی جانب اشارہ کر رہے ہیں جب وہ عربی پاشا کی قومی تحریک میں شریک تھے۔ اُس وقت اہل مصر کو وہ یہ تعلیم دے رہے تھے کہ اگرچہ فرمانروائے وقت اور حکام مقتدر کی اطاعت اِن پر لازم ہے لیکن اسی کے مقابل انہیں خاص خاص حقوق بھی حاصل ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اہل ملک کی ضروریات و خواہشات حکمران طبقہ کے علم میں لائی جائیں تاکہ وہ کوئی غلط راستہ اختیار نہ کریں جو ان خواہشات و ضروریات کی تکمیل کے منافی ہو۔ ان کا بیان ہے کہ اپنے بعض مقاصد میں میں تقریباً کامیاب ہو گیا تھا لیکن راعی اور رعیت کا معاملہ میں نے قسمت پر چھوڑ دیا تھا کہ خداوند تعالیٰ جس طرح چاہے اس معاملہ کی یکسوئی کرے کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ حکام اور رعیت کے تعلقات کی نوعیت

اُس بیج کا پھل ہے جو کوئی قوم خود ہی بوتی ہے اور خود ہی عرصہ تک اِس کاشت کی دیکھ بھال کرتی ہے اس وقت اسی تخم پاشی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال جب وہ مصر واپس ہوئے تو انہوں نے حکومت کی طرف پہلے سے کہیں زیادہ مصالحانہ روش اختیار کی یہاں تک کہ وہ علی الاعلان حکومتِ وقت کی حمایت کرنے لگے کیونکہ جیسا وہ کہا کرتے تھے کہ اب وہ اُس آزادی کے سچے قدردان ہو گئے تھے جو اس حکومت کی وجہ سے اہلِ ملک کو حاصل تھی اس نوبت پہ وہ مصطفےٰ فہمی پاشا وزیر اعظم کے خاص دوست اور مشیر تھے اور لارڈ کرومر سے بھی ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

۱۸۸۵ء کے آغاز میں پیرس میں خفیہ انجمن کے قیام کے بعد محمد عبدہ بیروت واپس ہوئے اور علامہ جمال الدین افغانی نے تنہا اس کام کو جاری رکھا۔ محمد عبدہ کے دوستوں نے بیروت میں انہیں خوش آمدید کہا اور بیروت میں ان کی قیام گاہ علماء، اہلِ قلم اور مختلف المذاق اشخاص کے اجتماع کی مرکز بن گئی۔ اپنی قیام گاہ پہ انہوں نے حضور رسالت مآبؐ کی حیات طیبّہ پہ لکچر دینے شروع کیے اور شہر کی دو مسجدوں میں انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر پہ فی البدیہہ تقریریں کیں۔ ان اجتماعات سے فائدہ اُٹھا کر جن میں ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ شریک رہتے تھے محمد عبدہ اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سب کے ساتھ وہ مساوی حُسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آتے تھے لیکن ہمیشہ بلا استثناء وہ اپنے ہی عقائد اور نظریات کی تشریح و توضیح کرتے تھے خواہ ان کا تعلق مذہب سے ہو یا علم و فن کی کسی شاخ سے۔

۱۸۸۵ء کے آخر میں انہیں مدرسہ سلطانیہ میں معلمی کی خدمت پیش کی گئی جسے انہوں نے قبول کیا۔ جیسا کہ ان کا قاعدہ تھا یہاں بھی انہوں نے مدرسہ کے نظم و نسق میں اصلاح کی، نصاب تعلیم پہ نظر ثانی کی اور اس میں دینیات فقہ اور تاریخ کے مضامین بھی شامل کیے۔ سارا دن وہ تعلیم دینے میں مصروف رہتے تھے اور ان کی بڑی کوشش یہ تھی کہ مدرسہ کی اخلاقی حالت اعلیٰ معیار کی ہو جائے۔ ادبی کام کے لیے بھی انہیں تھوڑا بہت وقت مل ہی جاتا تھا۔ انہوں نے علامہ جمال الدین کی

کتاب" ابطال مادیت" کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا ۔ اپنی دو تقریروں کو بھی انھوں نے کتابی شکل میں شائع کیا ۔ یہ تقریریں عربی ادب کے دو دقیق لیکن فصیح و بلیغ نمونوں کی بابت طلباء کے لیے تیار کی تھیں ۔ ان میں سے ایک نہج البلاغت اور دوسری مقامات بدیع الزمان الہمدانی کے متعلق تھی دینیات پر انھوں نے جو لکچر دیئے تھے وہ اگرچہ شائع نہیں ہوئے لیکن ان کی بعد کی تصنیف رسالۃ التوحید کے لیے بطور مواد کام آئے ۔ اس کے علاوہ اخباروں میں بھی کبھی کبھی ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے ۔

لیکن ان کی بے چین طبیعت اور بے تاب فطرت جو ہمہ وقت اصلاحی کوششوں کی طرف مائل رہتی تھی اس طرح تسکین نہیں پا سکتی تھی ۔ ان کا جذبہ عمل اپنے لیے اس سے زیادہ وسیع میدان تلاش کر رہا تھا شام اور سلطنت عثمانی کے مختلف حصوں میں سفر کرنے اور مختلف الخیال افراد سے ملاقات کرنے کی وجہ سے انھیں ترکی سلطنت کے حالات کا قریبی علم حاصل ہو گیا تھا ۔ اس لیے نہایت احتیاط اور قاعدہ کے ساتھ جیسا کہ ان کی طبیعت کا مقتضا تھا انھوں نے سلطنت عثمانی کے حالات پر دو رسالے لکھے اور جو کچھ خرابیاں اس سلطنت کے در و بست میں نظر آئیں ان کے دور کرنے کی تدابیر پیش کیں ۔ اس میں سے ایک رسالہ جس کا نام" مذہبی تعلیم کی اصلاح " تھا انھوں نے قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام کو بھی بھیجا ۔ اس رسالہ میں خلیفۃ المسلمین سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ میں ہر طرف مذہب اور اس کی ضروریات و تعلیمات سے لاعلمی اور ناواقفیت پھیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے اخلاقی انحطاط پیدا ہو گیا ہے اور بیرونی قوموں کو موقع مل گیا ہے کہ وہ اپنے مدارس کے ذریعہ مسلمان بچوں کے ذہن و دماغ کو متاثر کریں ۔ اس اخلاقی انحطاط کا بڑا سبب مذہبی تعلیم کا فقدان ہے اور اس کا ایک ہی علاج ہے یعنی مذہبی تعلیم جس نہج پر دی جا رہی ہے اس میں تبدیلی کی جائے ۔ وہ انسانوں کو ان کے مشاغل کی نوعیت اور تعلیمی حالت کے لحاظ سے تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں ۔ اس کے بعد وہ ہر گروہ کی ضروریات و حالات کے مطابق اس کے لیے ایک نصاب تعلیم

تجویز کرتے ہیں۔ یہ تجاویز انہوں نے اس کمیشن کے غور و ملاحظہ کے لیے پیش کی تھیں جس کو سلطان نے اپنی سلطنت کی تعلیمی حالت کی جانچ کرنے اور اس کے لیے اصلاحی تدابیر پیش کرنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ دوسرے مقالہ میں جس کا نام تھا "بیروت میں اصلاحات کے لیے چند تجاویز" اور جسے انہوں نے والیے بیروت کی خدمت میں پیش کیا تھا وہ بیروت کے تین[۳] بڑے صوبوں کے باشندوں کی تعلیمی حالت کا مرقع کھینچتے ہیں ان کی تعلیمی حالت ان کے مذہبی خیالات اور سیاسی رجحانات پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان خطرات کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو بیرونی اقوام کے مدارس اور ان کی پھیلائی ہوئی تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں اور کچھ تجویز کرتے ہیں کہ ملک میں عمدہ مذہبی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔

آخر کار بیروت میں ساڑھے تین سال قیام کے بعد چند با اثر اصحاب کی سفارش سے (جن میں ایک لارڈ کرومر بھی تھے) خدیو توفیق پاشا نے انہیں مصر میں داخل ہونے کی اجازت عطا کی اور ۱۸۸۸ء کے اواخر میں انہوں نے سرزمین مصر کو اپنی مراجعت کا شرف بخشا۔ بیروت میں اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ مصر سے روانگی کے بعد چھ سال کی درمیانی مدت میں انہوں نے یورپ کے اکثر ممالک کا سفر کر لیا تھا اور مغربی تمدن کا مشاہدہ دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ کیا تھا۔ اس تمدن کی ابتدائی جھلک انہوں نے ان جدید کتابوں میں دیکھی تھی جن کا اس زمانہ میں عربی میں ترجمہ ہوا تھا۔ انہوں نے اسلامی ممالک کا بھی سفر کیا اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط پر کافی غور و خوض کیا۔ اس طرح اس چھ[۶] سال کی جلاوطنی نے ان کی شخصیت کی تکمیل میں بڑا حصہ لیا خصوصاً سعی و عمل کے اس میدان میں قیادت کے لیے جس میں انہوں نے قدم رکھا تھا جن صفات کی ضرورت تھی وہ بھی بڑی حد تک اسی آوارہ وطنی کے زمانہ میں انہوں نے پیدا کیں۔ محمد رشید رضا لکھتے ہیں "یہ جلاوطنی اور غربت کی زندگی اور سب لوگوں کے لیے جنہیں مصر سے اخراج کا حکم دیا گیا تھا ایک مصیبت تھی لیکن محمد عبدہ کے لیے یہ جلاوطنی خداوند تعالیٰ کی سب سے بڑی برکت و نعمت تھی جس نے ان کی شخصیت کو مکمل کیا ان کے تجربہ

کو وسیع کیا اور دوسرے اسلامی ممالک میں ان کے افکار و نظریات کی تخم ریزی کی۔

سفرِ یورپ کے تجربات انہیں اتنے گراں بہا اور زندگی بخش معلوم ہوتے تھے (حالانکہ انہوں نے یورپ کا سفر خود اپنی رائے اور مرضی سے نہیں کیا تھا) کہ جب کبھی ان کے قول کے مطابق انہیں اپنے ذہن و دماغ کے لیے تازگی اور فرحت کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ بلا تامل یورپ کے ممالک کا سفر کیا کرتے تھے وہ لکھتے ہیں "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے یورپ کا سفر کیا ہو اور میرے دل میں یہ یقین جاگ نہ اٹھا ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ حالت بہت جلد عروج و ترقی سے بدل جائے گی"۔ جب وہ اپنے گرد مشکلات کا ایک حصار چنا ہوا دیکھتے تھے اور اہل ملک کی سُستی ہٹ دھرمی اور غفلت کے منظر پر نگاہ کرتے تھے تو یہ یقین بہت کچھ سرد پڑ جاتا تھا لیکن ان کا بیان ہے کہ جب کبھی میں یورپ واپس گیا تو پھر یہ دبی ہوئی امیدیں اور آرزوئیں اپنا نظر افروز چہرہ دکھانے لگتیں اور جن چیزوں کو میں ناممکنات خیال کرتا تھا وہ سہل الحصول نظر آنے لگتی تھیں"۔ یورپ کے سفر و قیام کے یہ پیہم اثرات تھے جو بالآخر اُن آخری مجاہدانہ کوششوں میں ظاہر ہوئے جو قومی فلاح و صلاح کے لیے ان کی طرف سے عمل میں آئیں۔

آخری دور

۱۸۸۸ء تا ۱۹۰۵ء

مصلح اور خادم قوم جب محمد عبدہ مصر واپس ہوئے تو اہل مصر نے ان کی جاں فروشیوں، ان کے ایثار اور ان کی اسلامی اور قومی خدمات کی کماحقہ قدر کی اور انہیں عزت و وقار کی وہ رفعت نصیب ہوئی جو کم لوگوں کو میسر آئی تھی۔ اپنی بقیہ زندگی کے کارہائے نمایاں سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اس عزت و سربلندی کے واقعتاً مستحق تھے۔ یکے بعد دیگرے انہیں ملک کی اعلیٰ ترین خدمات پیش کی گئیں اور ان کی ساری زندگی انہیں اہم خدمات کی انجام دہی میں صرف ہو گئی۔ ان کی کوششوں پر کبھی کبھی مخالفانہ تنقیدیں بھی ہوئیں۔ خصوصاً اپنی اصلاحی جدوجہد میں انہیں قائم شدہ حقوق رکھنے والی جماعتوں کے حملے بھی برداشت کرنا پڑے لیکن اس کے باوجود ان کے بڑے سے بڑے مخالف اور دشمن کو بھی ان کے خلوص ان کی نیک نیتی اور ان کی قومی اور مذہبی خدمات کی بے لوثی پر ایک منٹ کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا۔ مصر واپس آنے کے بعد سے آخری لمحات زندگی تک جو زمانہ گزرا اس میں انہوں نے اپنے ملک اور مذہب کی اہم ترین خدمات انجام دیں۔ اگرچہ ان کی زندگی کا یہ دور پُرآز واقعات نہ تھا۔ ان کی موت کے بعد ان کے متعلق جو بیان شائع ہوا وہ ان کی پوری زندگی اور اس زندگی کے کارہائے نمایاں کا خلاصہ ہے۔ وہ یہ ہے "مصر میں کوئی اہم اور مہتم بالشان کام نہیں انجام دیا گیا جس میں انہوں نے اوروں سے پہلے اپنی مدد کا ہاتھ نہ بڑھایا ہو اور اوروں سے زیادہ اپنی توجہ

اور کوشش صرف نہ کی ہو۔"

خدیو توفیق پاشا نے معافی عطا کرنے کے بعد انہیں عدالت ابتدائی کا قاضی مقرر کیا۔ ان کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ پھر دار العلوم میں درس و تدریس کا مشغلہ شروع کریں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ معلمی ہی ان کا اصلی پیشہ ہے جسے وہ کامیابی کے ساتھ چلا سکتے ہیں لیکن خدیو توفیق پاشا ان کی اس خواہش کو پورا کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کو ڈر تھا کہ محمد عبدہ کے سیاسی خیالات کا اثر دار العلوم کے طلبہ پر ضرور پڑے گا۔ دو سال بعد قاہرہ میں انہیں عدالت مرافعہ کی مجلس شوریٰ کا رکن مقرر کیا گیا۔

اپنے عدالتی کام میں محمد عبدہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ حق و انصاف کے مقتضیات پورے ہوں اور جہاں تک ممکن ہو فریقین میں باہمی مصالحت ہو جائے اس مقصد کی خاطر محمد عبدہ نے ہمیشہ اپنی آزاد رائے اور فیصلہ پر اعتماد کیا اور قانونی موشگافیوں سے ہمیشہ اغماض برتا جس کے لیے قانون دان حضرات نے ان پر اعتراضات بھی کیے۔ بعض اوقات تو وہ صریحاً قانون کے خلاف عمل کرتے تھے۔ مثلاً وہ ایسے گواہوں کو سزا دلواتے جن کی شہادت انہیں جھوٹی معلوم ہوتی۔ جب تک وہ اس خدمت پر مامور رہے ان کی کوشش یہ رہی کہ دو چیزوں کے متعلق وہ عوام الناس کے اخلاقی ضمیر کو بیدار کریں۔ اوّل جھوٹی گواہی دوسرے محسن کاری۔ اُن کے فیصلے اتنے صحیح اور جچے تلے ہوتے تھے اور حقیقی مجرم کو وہ ایسے عجیب و غریب طریقہ سے بیک نظر شناخت کر لیتے تھے کہ اُن کے یہ دو صفات زبان زدِ خاص و عام ہو گئے۔

جامعہ ازھر کی اصلاح جامعہ ازھر کی اصلاح کا خیال جوان کے دل میں طالب علمی کے ایام سے پرورش پا رہا تھا اور جسے علامہ جمال الدین افغانی کی رفاقت نے اور زیادہ تقویت پہنچائی تھی اب بالکل پختہ ہو گیا چونکہ جامعہ ازھر پورے عالم اسلامی میں علم و فضل کا مرکز تھی اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ ازھر کی اصلاح درحقیقت مسلمانانِ عالم کی اصلاح ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ازھر کے طریق تعلیم اور

وہاں کے رائج الوقت انتظامی قواعد وضوابط کی اصلاح ہو جائے، نصاب تعلیم کو اتنی وسعت دے دی جائے کہ اس میں جدید مغربی علوم بھی داخل ہو جائیں اور اس طرح جامعہ ازھر یورپ کی بڑی بڑی جامعات کے ہم پلہ ہو جائے اور ساتھ ساتھ قدامت پرستی کے اس مرکز میں شریعت اسلام کو حالاتِ زمانہ سے مطابقت دینے کا کام بھی انجام پذیر ہو جائے تو بجا طور سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جامعہ ازھر کی مسلّمہ عظمت اور عالم اسلامی میں اس کا قائم شدہ اثر ونفوذ ان تغیرات اور اصلاحات کو صرف مصر ہی میں نہیں بلکہ عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دے گا۔ اس طرح سے جامعہ ازھر پوری دنیائے اسلام کے لیے روشنی کا ایک مینار ہو جائے گی اور اس مصدر نور وحرارت سے ساری دنیا کے مسلمان ضیا یاب ہوں گے۔ محمد عبدہ کی رائے تھی کہ یا تو جامعہ ازھر کو حقیقی معنوں میں از سر نو زندہ کرنا چاہیے یا اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہیے۔

اپنی طالب علمی کے زمانہ میں محمد عبدہ نے بطریق تجربہ ازھر کی اصلاح کے لیے کوششیں کی تھیں مصر واپس آنے کے بعد انہوں نے ازھر کے ناظم سے ملاقات کی اور انہیں ازھر کے نصاب تعلیم میں بعض تبدیلیوں کا مشورہ دیا۔ ان کوششوں کی وجہ سے مخالفت کا جو طوفان برپا ہوا اس سے محمد عبدہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خدیو کی مدد کے بغیر کسی قسم کی اصلاح ممکن نہیں ہے مگر توفیق پاشا اس معاملہ میں اصلاح کے حامیوں کی مدد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں جب توفیق پاشا کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا عباس حلمی تخت نشین ہوا تو محمد عبدہ نے ازھر کی اصلاح کے لیے چند تجاویز اس کے سامنے پیش کیں اور اپنے [illegible] کہ نیا بادشاہ ان کی اصلاحی کوششوں سے موافقت کرے گا بالآخر ان کی یہ کوشش کامیاب ہوئی اور خدیو نے ایک قانون کے ذریعہ جو ۱۲ رجب المرجب ۱۳۱۲ھ کو منظور ہوا ایک انتظامی کمیٹی مقرر کی جو ازھر کے ممتاز شیوخ پر مشتمل تھی محمد عبدہ اور ان کے دوست شیخ عبد الکریم سلمان اس کمیٹی میں حکومت کے نمائندے مقرر ہوئے۔ ابتدا ہی سے محمد عبدہ اس کمیٹی کے

روح رواں تھے ۔

اگرچہ محمد عبدہ کو اب خدیو اور اس کی پوری حکومت کی تائید حاصل تھی پھر بھی ان کی خواہش تھی کہ جو اصلاحات بھی روبعمل لائی جائیں وہ ازھر کے شیوخ اور اساتذہ کی مرضی اور رضامندی سے نافذ ہوں اس غرض سے انہوں نے اصلاح کی ابتدا اس طرح کی کہ جامعہ ازھر کے اساتذہ اور معلّمین کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا۔ پہلے حالت یہ تھی کہ ایک طرف تو بعض اساتذہ اور معلّمین چھ سو قرش[1] ماہوار تنخواہ پاتے تھے اور دوسری طرف بعض اساتذہ کو صرف سو [100] قرش ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور بعض ایسے بھی تھے جو اس قلیل مشاہرہ سے بھی محروم رہتے تھے اور جو کچھ انہیں طلباء سے یا فرصت کے اوقات میں اور کوئی کام کرنے سے مل جاتا تھا اسی پہ قناعت کر لیتے تھے ۔ محمد عبدہ نے اس غرض سے سرکاری خزانہ سے ایک ہزار پاؤنڈ کی رقم کی منظوری حاصل کر لی اور حکومت سے مزید رقم کی منظوری کا وعدہ بھی لے لیا لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کر دی کہ منظور شدہ رقم ایک خاص قاعدہ کے ساتھ شیخ الازھر کی صوابدید کے مطابق صرف کی جائے (جیسا کہ اس سے قبل ہوتا آیا تھا) اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمی اور انتظامی حالت میں ایسی نمایاں اصلاح ظاہر ہو کہ جس کی بنا پہ منظور شدہ رقم میں اور اضافہ کیا جا سکے ۔

اس شرط سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ازھر کے اساتذہ کو معیارِ قابلیت کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا اور ہر گروہ کے لیے ایک متعیّن مشاہرہ مقرر کر دیا جس کی وجہ سے اساتذہ کو معلوم رہتا تھا کہ انہیں کیا مشاہرہ ملے گا۔ صرف شیخ الازھر کے رحم و کرم پر اب ان کی تنخواہ کا دارومدار نہیں تھا ۔

محمد عبدہ نے طالب علموں کے رہنے سہنے کے طریقوں کی بھی تحقیق کی اور اس تحقیق نے ان پر ظاہر کیا کہ ان کی رہائش کا طریقہ اور وہ ماحول جس میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے نہایت مضرِ صحت تھا کیونکہ کثرت تعداد کی وجہ سے کمروں میں بھیڑ لگی رہتی تھی۔ پھر روٹیاں جو انہیں ملتی تھیں ناکافی ہوتی تھیں اور پرانے فرسودہ طریقوں سے پکائی جاتی تھیں ۔ انہوں نے روٹیوں کی تعداد پانچ ہزار سے پندرہ ہزار [15]

[1] مصری قرش ۲ کے برابر ہوتا ہے۔

کر دی اس کے لیے انہیں محکمہ وقف سے مزید رقم حاصل کرنا پڑی۔ محمد عبدُہ نے جامعہ ازھر کے اوقات کی حالت بھی بہت کچھ درست کی کیونکہ روز بروز ان کی حالت خراب ہوتی جاتی تھی۔ اس انتظامی اصلاح کی وجہ سے آمدنی چار ہزار پونڈ سے بڑھ کر چودہ ہزار ساڑھے سات سو پونڈ ہو گئی۔ روٹیوں کی روزانہ تقسیم ازھر کے بعض اساتذہ کے لیے ایک وافر آمدنی کا ذریعہ بن گئی تھی۔ علاوہ بریں اس کی وجہ سے آپس میں جھگڑوں اور مخالفتوں کا طوفان برپا رہتا تھا اس لیے محمد عبدُہ نے اس انتظام کی کی اصلاح کے لیے کمیٹی کے سامنے بعض تدابیر پیش کیں لیکن کمیٹی نے ان کو پس پشت ڈال دیا۔ طلباء کی خوابگاہوں کے لیے انہوں نے کمروں کی تعمیر کا انتظام کیا فرنیچر کی مرمت کرائی جہاں نئے فرنیچر کی ضرورت محسوس ہوئی اس کی فراہمی کا انتظام کیا اور مفید صحت تدابیر روبعمل لائے۔ طلباء کے معائنہ طبّی کی غرض سے ایک طبیب کا تقرر کیا۔ انہیں کے ایماء پر جامعہ ازھر میں ایک چھوٹا سا دواخانہ کھولا گیا جس میں سب ضروری دوائیں موجود رہتی تھیں بعد میں اس دواخانہ نے وسعت پاکر ایک باقاعدہ اسپتال کی شکل اختیار کر لی۔

جامعہ ازھر کے انتظامی در و بست پر بھی انہوں نے بہت کچھ توجہ کی۔ جامعہ کی عمارات میں سے چند کمرے دفتری کاروبار کے لیے مخصوص کر دیئے گئے اور اہلکاروں اور منشیوں کی ایک کافی تعداد اس غرض سے مقرر کی گئی کہ وہ انتظامی امور میں شیخ الازھر کا ہاتھ بٹائیں اور نئی تنظیم کو کامیاب بنانے میں مدد دیں۔ اس سے پہلے قاعدہ یہ تھا کہ شیخ الازھر انتظامی کام اپنے گھر میں انجام دیتے تھے جہاں طلباء اور اساتذہ کو معاملات کے تصفیہ کے لیے جانا پڑتا تھا۔ جزوی امور کے انصرام کا سررشتہ شیخ الازھر کے معتمد کے ہاتھ میں تھا جس کی وجہ سے معتمد مذکور کافی اختیارات کا مالک بن بیٹھا تھا۔ نصاب تعلیم پر بھی کافی توجہ کی گئی۔ اس خیال سے کہ جو کچھ تبدیلیاں عمل میں آئیں انہیں ازھر کے اساتذہ کی رضامندی حاصل ہو جامعہ کے تیس ممتاز اساتذہ کی ایک کمیٹی اس غرض سے

مقرر کی گئی کہ وہ جاری شدہ نصاب تعلیم اور اس میں مناسب تبدیلیوں کی ضرورت پر غور وفکر کرنے کے بعد انتظامی کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اُن مضامین کی صراحت کر دی گئی جن کی تعلیم بہرحال ضروری تھی۔ اسی طرح وہ مضامین بھی بتا دیے گئے جن کی تعلیم اگرچہ بجائے خود ضروری نہ تھی لیکن مذکورہ بالا بنیادی علوم کی تحصیل میں آسانی پیدا کرنے کے لحاظ سے اہم تھی۔ ان موخرالذکر علوم میں ریاضی، الجبرا، تاریخ اسلام، اقلیدس اور جغرافیہ بھی شامل تھے۔ عالم کی سند حاصل کرنے کے لیے ہر طالب علم پر لازم تھا کہ وہ اوّل الذکر مضامین میں سے سب میں کامیابی حاصل کرے اور موخرالذکر مضامین سے چند مضامین میں کامیاب ہو۔ اِس امر کی صراحت بھی کر دی گئی کہ تعلیم کے ابتدائی چار[۴] سالوں میں طالب علم کو کسی کتاب کے حاشیہ یا شرح کے مطالعہ سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہیے۔ بلکہ اس کو سادہ اور عام فہم طریقہ سے مذہب کی مختلف شاخوں میں ضروری اور اہم معلومات بہم پہنچائے جانے چاہییں اور زیادہ تر اُس کی اخلاقی نشوونما پر توجہ کی جانی چاہیے۔

اساتذہ سے مشورہ کے بعد انتظامی کمیٹی نے متعدد ضمنی قوانین بھی نافذ کیے جن میں سے بعض طریقہ تعلیم کو منضبط کرنے کی غرض سے بنائے گئے تھے اور بعض اساتذہ اور طلباء کے تعلقات سے متعلق تھے۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ نئے انتظامات کے بعد سے طلباء اور اساتذہ دونوں اپنے اپنے کام میں سرگرمی اور انہماک دکھانے لگے۔ پہلے اُن طلباء کی تعداد جو امتحان میں شریک ہوتے تھے چھ[۶] سے زائد نہیں ہوتی تھی اور اوسطاً امتحان دینے والے طلباء کی تعداد تین[۳] فی سال تھی۔ لیکن نئے قوانین کے نفاذ کے بعد سے یہ تعداد پچانوے[۹۵] تک پہنچ گئی۔ ازہر کے اساتذہ کا خیال تھا کہ نصاب تعلیم میں جدید علوم کے شامل کر دینے سے لڑکے قدیم علوم سے غفلت برتنے لگیں گے اور تحصیل میں دل نہیں لگائیں گے۔ محمد عبدہ نے ایک آزمائشی امتحان لے کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ طلباء زیادہ تعداد میں کامیاب ہوتے ہیں جو علوم جدیدہ اور قدیم علوم دونوں کی تعلیم حاصل

کرتے ہیں بمقابلہ ان طلبار کے جو صرف قدیم علوم کی تحصیل میں مصروف رہتے ہیں۔ تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ جامعہ ازھر کے کتب خانہ کی حالت بہت خستہ تھی بلکہ اس کا وجود و عدم برابر تھا۔ اکثر کتابیں جو کیڑوں کی نظر نہیں ہوئی تھیں مختلف رواقوں میں بے ترتیب پڑی ہوئی تھیں۔ ان کی حالت بہت ردی تھی۔ بہت سے نایاب نسخے مغربی علمار کے ہاتھوں بک چکے تھے اور جو باقی تھے وہ سستے داموں کتب فروشوں کو بیچے جا رہے تھے۔ ان مختلف مقامات سے جہاں کتابیں بکھری پڑی تھیں انہیں ایک مقام پر جو کتب خانہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا تھیلوں میں رکھ کر پہنچا دیا گیا۔ وہاں ان کی ترتیب و تہذیب کی گئی اور مضامین کے لحاظ سے انہیں تقسیم کر دیا گیا۔ اضلاع کے مدارس میں بھی کتب خانے قائم کیے گئے اور انتظامی امور میں یہ مدارس جامعہ ازھر سے ملحق کر دیے گئے۔ اس طرح سے یہ تمام مدارس انہیں قواعد و ضوابط کے تحت آگئے جو ازھر میں نافذ تھے۔ ازھر میں جب کوئی نئی اصلاح ہوتی تھی تو اس کے اثرات دور دور تک پھیل جاتے تھے۔ ایسا کرنے میں محمد عبدہ کا یہ مقصد تھا کہ ازھر ملک کی تعلیمی اصلاح اور ذہنی انقلاب کا مرکز بن جائے جس کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ میں زندگی اور حرکت کی ایک نئی لہر دوڑ جائے۔ یہاں اس چیز کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محمد عبدہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ عربی ادب کا احیار کیا جائے اور قدیم عربی معیار تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ انہوں نے نہ صرف اپنی تقریروں خطبوں اور تحریروں میں فصاحت و بلاغت کے نمونے پیش کر کے اس مقصد کی تکمیل کی بلکہ محکمہ وقف سے ایک خاص رقم اس غرض سے منظور کرائی کہ ازھر میں عربی ادب کا ایک مسلّم الثبوت استاد مقرر کیا جائے جو عربی زبان کی اصلی بلاغت کو زندہ اور مجسّم کر دے۔

جامعہ ازھر[1] کی اصلاح کی غرض سے محمد عبدہ نے جو کوششیں کی تھیں ان کا تذکرہ اس شرح و بسط سے اوپر اس لیے کیا گیا ہے کہ محمد عبدہ کے نزدیک یہ اصلاح ان کی زندگی کے اہم ترین

[1] المناریوں

مقاصد میں سے تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہوگئے تو کل عالم اسلام کی اصلاح کا راستہ صاف ہو جائے گا اس لیے اس کام میں انھوں نے اپنے وقت و فرصت کا ایک ایک لمحہ اور اپنے ذہن و دماغ کی ساری قابلیتیں صرف کر دیں۔ لیکن بد قسمتی سے جو کچھ مستقل کامیابی انہیں اس باب میں حاصل ہوئی وہ ان کے جوش و خلوص اور ان کی اَن تھک کوششوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اصلاحات مکمل طور سے عمل میں آئیں خصوصاً نظم و نسق کی حد تک کوئی کمی باقی نہیں رہ گئی لیکن جہاں تک محمد عبدہ کے اُن مقاصد کا تعلق تھا جو ازھر کی روحانی و اخلاقی اور عقلی اصلاح کے لیے ان کے پیش نظر تھے ان کے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ محمد عبدہ نے ان کی تکمیل کی داغ بیل ڈال دی۔ یہ نہ تھا کہ ازھر کے تمام اساتذہ اور طلباء اصلاح کے مخالف تھے۔ اس کے برخلاف بعض سربرآوردہ اساتذہ اور ممتاز طلباء اصلاح کی ضرورت کے سچے دل سے قائل تھے اور انھوں نے محمد عبدُہ کی ہر طرح مدد کی اور ان کی ہمت بڑھائی لیکن یہ اسی وقت تک تھا جب تک کہ محمد عبدُہ کو خدیو کی تائید اور حمایت حاصل تھی۔ شومئ قسمت سے خدیو کے الطاف و عنایات تھوڑے ہی عرصہ میں مخالفت سے بدل گئے۔ اس طرح رجعت پسند عناصر کا پھر غلبہ ہو گیا اور آخر کار ۱۹۰۵ء میں محمد عبدُہ نے مایوس ہو کر انتظامی کمیٹی سے استعفےٰ دے دیا۔ جامعہ ازہر سے ان کا تعلق اب ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا اور کچھ عرصہ کے بعد جامعہ مذکور پھر اپنی اصلی حالت پر عود کر آئی۔

مفتی مصر جون ۱۸۹۹ء میں خدیو کی سفارش سے محمد عبدُہ مصر کے مفتی مقرر ہوئے اس عہدہ کے حامل کی حیثیت سے وہ شریعت اسلام کے شارح اور مفسّر تھے اور جن معاملات میں ان سے استفتا کیا جاتا تھا اُن سے متعلق ان کے فتوے مستند اور فیصلہ کن ہوتے تھے۔ اِس سے پہلے جو لوگ اِس خدمت پر مامور تھے وہ اپنے تئیں حکومت کا مشیر قانونی خیال کرتے تھے اور بجز اُن

امور کے جن کی بابت سرکاری محکمہ جات استفتا کرتے یا قانونی مشورہ طلب کرتے اور کسی معاملہ میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ اگر رعایا کا کوئی فرد ان سے فتویٰ طلب کرتا تو وہ اُس پہ کوئی توجہ نہیں کرتے تھے۔ اِن حالات کی وجہ سے جب محمد عبدُہ اُس خدمت پہ مامور کیے گئے تو انہیں اندیشہ پیدا ہوا کہ اگرچہ یہ خدمت سب سے زیادہ اہم خدمت ہے جس کے لیے کوئی مسلمان فقیہہ تمنا کر سکتا ہے لیکن اس کا دائرہ کار اس قدر تنگ ہے اور اس میں خصوصی مہارت کی اتنی ضرورت ہے کہ اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں ان کے جذبۂ عمل کے لیے کوئی راہ اور ان کی اصلاحی سرگرمیوں کے لیے کوئی وقت اور موقع نہ ہوگا۔ لیکن جس طرح دوسری سرکاری خدمات جن پر ان کا تقرر کیا گیا تھا ان کی شخصی عظمت و وقار کی وجہ سے ایک نئی اہمیت اور وزن کی مالک ہو گئی تھیں اسی طرح اس نئے عہدہ میں بھی ان کی شخصیت نے چار چاند لگا دیے۔ انہوں نے کام شروع کرتے ہی اہل ملک کو شرعی امور میں مشورہ دینا شروع کیا اور استفتا کرنے پر عوام الناس کو بھی فتوے دینے لگے۔ اس طرح وہ خدمت جس کی پہلے کوئی اہمیت نہ تھی بڑے اقتدار و اثر کا وسیلہ ہو گئی محمد عبدُہ اس خدمت پر انتقال کے وقت تک مامور رہے۔

مصر میں اُس وقت کئی ایک غیر مسلم اقوام بھی متوطن تھیں۔ اور مصر کے مسلمانوں کو ان قوموں سے روزمرہ کی زندگی میں سابقہ پڑتا تھا۔ اس وجہ سے بہت سے ایسے مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے تھے جن میں اسلامی شریعت کی تعبیر کی ضرورت داعی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ زمانہ جدید کے بدلے ہوئے حالات نے بھی نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے تھے خصوصاً اس وجہ سے کہ مصر کے مسلمانوں پر اسلامی قوانین کے ماسوا دوسرے قوانین کی بھی عملداری قائم ہو گئی تھی۔ ایسے حالات میں محمد عبدُہ کے سامنے مختلف النوع امور و مسائل پیش کیے جاتے تھے اور ان سے فتویٰ طلب کیا جاتا تھا۔ اُن فتووں سے جو محمد عبدُہ نے اس زمانہ میں جاری کیے تھے ہمیں ان کی بلند نظری

اور روایت پرستی اور تقلید کی بندشوں سے ان کی بالکلیہ آزادی کا حال معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کو جدید حالات زندگی سے مطابقت دینے کے لیے انھوں نے بڑی پُرجوش اور مخلصانہ کوششیں کی تھیں لیکن ان کی وسعتِ نظر اور آزادخیالی کی وجہ سے ان کے خلاف ایک عام برہمی پھیل گئی اور قدامت پرست طبقہ ان کی مخالفت پر آمادہ ہوگیا۔ ان کے دو فتوے سب سے زیادہ ہدفِ تنقید بنے۔ پہلا فتویٰ یہ تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے ذبح کیے ہوئے جانور کا گوشت کھانا مسلمانوں کے لیے جائز ہے۔ دوسرا یہ تھا کہ ڈاکخانوں کے سیونگ بنک میں روپیہ رکھنا اور اُس سے سود حاصل کرنا بھی جائز ہے ان فتووں کی وجہ سے ان کی شہرت دُور دُور پھیل گئی اور وہ اپنے زمانہ کے ائمۂ مجتہدین میں شمار کیے جانے لگے یہاں تک کہ دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمان بھی اُن سے استفتا کرنے لگے۔

لیکن محمد عبدُہ نے اپنی سرگرمیوں کو صرف فتوے دینے تک محدود نہیں رکھا۔ ان کی نمایاں خدمات میں سے ایک یہ خدمت بھی تھی کہ انھوں نے مصر کے محاکم الشرعیۃ (وہ عدالتیں جو مسلمانوں کے معاشرتی امور مثلاً نکاح طلاق اور خلع وغیرہ کی نسبت شریعت کی رو سے فیصلے صادر کیا کرتی تھیں) کی بابت مکمل تحقیقات کی۔ مفتی کی حیثیت سے اس نوع کی تحقیقات ان کے اختیارات میں داخل تھی۔ وہ خود بھی دل سے چاہتے تھے کہ ان عدالتوں کی کارکردگی اعلیٰ درجہ کی ہو اور ملک میں ان کی وقعت اور ان کا احترام قائم ہو۔ حکومت نے اس تحقیقات کی غرض سے انھیں کامل اختیارات دے دیے تھے۔ انھوں نے ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک دَورہ کر کے ہر صوبہ داری اور ضلع داری عدالت کا معائنہ کیا اور شخصی ملاقاتوں کے ذریعہ ان عدالتوں اور ان کے حکام کی حالت معلوم کی۔ اس تحقیقات سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان عدالتوں کے ناکارہ ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ حکام عدالت نااہل تھے صحیح عدالتی طریق کار

پر عمل نہیں کیا جا رہا تھا ججوں اور دوسرے عدالتی عہدہ داروں کی تنخواہیں بہت کم تھیں عمارتیں جن میں عام طور سے عدالتیں قائم تھیں اس کام کے لیے بالکل ناموزوں تھیں۔ اپنی رپورٹ میں انھوں نے اُس وقت کی عدالتوں کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اصلاح کی سفارشیں کیں اور ججوں کی تعلیم و تربیت کا طریقہ بتایا۔ اس رپورٹ کے پیش ہونے پر حکومت نے اس کی پیش کردہ سفارشات پر غور کیا اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے موزوں کارروائی کی۔ مجلس قانون ساز نے بھی اس زمانہ میں عدالتوں کی اصلاح کی طرف توجہ منعطف کی اور مجلس مذکور کی سفارش پر حکومت نے دو کمیٹیوں کا تقرر کیا۔ ایک کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ جملہ عدالتی فیصلہ جات یکجا کرے تا کہ نظائر کا ایک مجموعہ تیار کیا جا سکے جو ججوں کو فیصلہ دینے میں معاون ثابت ہو۔ دوسری کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ وہ ججوں کی تربیت و تعلیم کے لیے ایک مدرسہ کی تجویز پیش کرے محمد عبدُہ ان دونوں کمیٹیوں کے صدر مقرر کیے گئے۔ انھوں نے اپنی آخری علالت سے چند روز قبل ہی مجوزہ مدرسہ کے متعلق اپنی سفارشات پیش کر دی تھیں۔

مفتی کی حیثیت سے وہ محکمہ وقف کی مجلس اعلیٰ کے رکن بھی تھے۔ انہیں کی کوششوں سے ایک کمیٹی ان کی صدارت میں اس غرض سے مقرر کی گئی کہ وہ اصلاح مساجد کی بابت اپنی رپورٹ پیش کرے۔ محمد عبدُہ نے خود ہی یہ رپورٹ مرتب کی جس میں اصلاح مساجد کے لیے مختلف تجاویز پیش کیں مثلاً انھوں نے یہ رائے دی کہ مساجد کے خطیب، امام، مؤذن غرضکہ جتنے ملازمین مساجد سے متعلق ہیں سب کو مختلف درجات کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے دوئم مساجد کے خطیب اور امام وغیرہ اچھی قابلیت کے لوگ ہوں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ازھر کے تعلیم یافتہ اشخاص سے ان جگہوں کو پُر کیا جائے۔ ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر کے ان سے زائد کام بھی لیا جائے مثلاً وہ نمازیوں کو تھوڑی بہت مذہبی تعلیم بھی دیں۔ اس رپورٹ کو مجلس قانون ساز نے بھی منظور

کر دیا تھا لیکن خدیو کی مدافعت کی وجہ سے اس کی سفارشات کو پورے طور سے عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔

رکن مجلس قانون ساز | ۲۵ جون ۱۸۹۹ء کو محمد عبدہ مجلس قانون ساز کے مستقل رکن مقرر ہوئے۔ ۲۹ جون کو انھوں نے مجلس کے پہلے اجلاس میں شرکت کی۔ مصر میں اس وقت نیابتی حکومت کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ چیز اس بات سے بھی ظاہر تھی کہ مجلس قانون ساز کے اختیارات بالکل محدود تھے۔ اور اس کی حیثیت صرف مشاورتی تھی۔ طریقہ کار بے قاعدہ اور غیر منضبط تھا۔ اہم معاملات میں مجلس مداخلت کرتے ہوئے پس و پیش کرتی تھی۔ ارکان مجلس حکومت کی طرف سے مشتبہ رہتے تھے اور خود حکومت کو مجلس پر پورا اعتماد نہ تھا۔ محمد عبدہ نے مجلس قانون ساز کی بے بہا خدمت کی۔ انھوں نے اپنے تئیں پارلیمانی[1] کام کا اہل ثابت کر دکھایا۔ وہ ایک پُرجوش مقرر اور پختہ کار قانون داں تھے۔ اور ہر قسم کے معاملات پر مستحکم اور صائب رائے دینے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اس لیے بہت جلد وہ مجلس پر چھا گئے۔ ان کی رائے ہمیشہ مجلس کے لیے بڑی وزن کی مالک تھی۔ وہ اُن تمام کمیٹیوں کے صدر ہوتے تھے جنھیں حکومت معاملات سلطنت اور امور مملکت پر غور و فکر کرنے کی غرض سے مقرر کرتی تھی۔ ان کی قیادت میں مجلس کا اثر و رسوخ عوام الناس اور حکومت دونوں پر بہت بڑھ گیا انھیں فرائض کی ادائگی میں وہ اپنے وقت و فرصت کا بہترین حصہ گزارتے تھے کیونکہ انھیں یقین تھا کہ وہ اس طرح نیابتی حکومت کے نشو و ارتقاء کی رفتار تیز کر رہے ہیں۔ ان کی کوششوں سے مجلس کی کارکردگی بڑھ رہی تھی اُس میں عوام کی ضروریات و جذبات کا احساس ترقی کر رہا تھا۔ اِس لیے ضرور تھا کہ یہ روایات جن کی داغ بیل وہ ڈال رہے تھے آنے والے اراکین مجلس کو اپنے قالب میں ڈھال لیں۔ پھر ان کی مساعی جمیلہ سے اہل ملک اور عامۃ الناس کو حکومت کے معاملات اور

[1] PARLIMENTRY

ملک کے نظم ونسق سے تعاون اور اشتراکِ عمل کا درس مل رہا تھا اور اس طرح وہ نیابتی حکومت کے لیے ضروری تربیت حاصل کر رہے تھے۔

مسلم امدادی انجمن | یورپ کے سفر میں محمد عبدہ مغربی زندگی کی ایک خصوصیت سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ مغرب میں انھوں نے دیکھا کہ لوگ خیراتی کاموں میں بڑا حصہ لیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہاں بے شمار انجمنیں قائم ہیں۔ پبلک میں بھی ان انجمنوں اور اداروں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ دیکھ کر انہیں خیال پیدا ہوا کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی تقلید مسلمانوں کو بھی کرنی چاہیے۔ اگرچہ اسلام نے خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ پر بڑا زور دیا ہے اور اسلامی ممالک میں غریبوں کی خبرگیری اور شخصی امداد کا طریقہ عام ہے لیکن مسلمانوں نے خیرات اور امداد کے لیے اجتماعی اداروں کے قیام کی طرف مطلق توجہ نہیں کی ہے۔ چنانچہ غریبوں کی خبرگیری اور ضعیفوں اور مسکینوں کی اعانت میں مسلمانوں کو باہمی تعاون اور اجتماعی جدوجہد کا سبق دینے کے لیے اور اُمرا میں غربا کی طرف رحم وکرم کے جذبات پیدا کرنے کے لیے انھوں نے ایک امدادی انجمن کے قیام میں بڑا حصہ لیا اور خود اس انجمن کا رکن بننا منظور کیا۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ جو مسلمان معاش سے محروم ہوں یا روزی کمانے کے قابل نہ ہوں ان کی امداد کی جائے اور ایسے غریب بچوں کے لیے مدارس کھولے جائیں جو اتنے غیر مستطیع ہوں کہ سرکاری مدارس کے اخراجات بھی نہ ادا کر سکیں۔ انھوں نے انجمن کے بانیوں کے ساتھ اس مقصد سے تعاون کیا کہ انجمن کو بڑے بڑے اہلِ ثروت اور ذی مقدور لوگوں کی سرپرستی حاصل ہو جائے تاکہ انجمن کو جو لوگ اپنے ذاتی اغراض کے ماتحت بدنام کرنا چاہتے تھے اور حکومت کو اس کے خلاف اُبھارنا چاہتے تھے ان کی مخالفتوں کا مقابلہ بھی کیا جا سکے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں محمد عبدہ اس کی صدارت کے لیے منتخب کیے گئے اور آخر عمر تک اس انجمن کے صدر رہے

ادبی احیاء کی کوششیں | اس سے پہلے محمد عبدہ کی اُن کوششوں کا تذکرہ کیا جا چکا ہے جنہیں وہ الوقائع المصریہ کی امارت کے زمانہ میں عربی ادب کے احیاء کی غرض سے عمل میں لائے تھے ان کوششوں کا محرک صرف علمی اور ادبی ذوق نہ تھا۔ بلکہ محمد عبدہ کا خیال تھا کہ عربی زبان اسلام کے لیے بمنزلہ بنیاد کے ہے وہ کہتے تھے کہ مسلمانوں میں اُس وقت تک سچی مذہبیت نہیں پیدا ہو سکتی ہے جب تک کہ عربی زبان سے واقفیت ان میں عام نہ ہو جائے۔ اس لیے مسلمانوں کی اصلاح کا ایک ذریعہ عربی زبان کی اصلاح بھی ہے۔ اپنی ایک تقریر میں انہوں نے اس خیال کی توضیح کی ہے۔ وہ کہتے ہیں "عربی زبان سے ناواقفیت کے سبب سے مسلمانوں کی بڑی اکثریت اپنے مذہبی علوم سے بے بہرہ ہے اور اصل مذہب اسی لیے عامۃ المسلمین کی رسائی سے باہر ہے۔ کیونکہ قدیم عربی ادب میں علم و فضل کے ایسے جواہر پارے اور مذہبی علوم کے ایسے ایسے دُرِّ بے بہا پردہ خفا میں پڑے ہوئے ہیں کہ کوئی شخص جو عربی زبان پر حاوی نہیں ہے اُن تک نہیں پہنچ سکتا ہے"۔ لیکن وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ عربی زبان کا صحیح علم اِن کتابوں کے واسطہ سے نہیں حاصل ہو سکتا ہے جو ازھر کے نصاب میں اس زمانہ میں داخل تھیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ مسلم ائمہ اور علماء کی بڑی بڑی تصانیف جو ماضی کے دور دراز گوشوں میں پڑی ہوئی تھیں پھر روشنی میں لائی جائیں اور انہیں از سر نو زندگی بخشی جائے۔ اس غرض سے ۱۹۰۰ء میں انہوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا نام انجمن احیاء علوم عربیہ تھا۔ محمد عبدہ اس انجمن کے صدر تھے۔ ان کی کوششوں سے فن خطابت پر دو مشہور تصنیفات کے قلمی نسخے دوسرے ممالک سے حاصل کیے گئے اور انہیں مرتب و مہذب کرنے کے بعد شائع کر دیا گیا۔ ایک بڑے عالم دین کی مدد سے انہوں نے عربی علم اللسان پر ایک مشہور تصنیف کو سترہ جلدوں میں شائع کیا۔ اس کے بعد امام مالکؒ کی مشہور تصنیف موطا کے قلمی نسخے طونس سے منگوائے

گئے اور انہیں مرتب کرنے کے اخراجات برداشت کیے گئے۔ اس کے علاوہ اس انجمن نے وظائف اور رقمی امداد کے ذریعہ اُن تمام اہل قلم کی امداد بھی کی جو غیر زبانوں سے عربی میں کتابیں ترجمہ کر کے اِس ادبی احیاء کی رفتار بڑھا رہے تھے۔

حمایت اسلام | اپنے استاد سید جمال الدین افغانی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے محمد عبدہٗ نے حسب موقع ان الزامات اور حملوں کے خلاف اپنے مذہب کی حمایت کی جو عیسائی اور مغربی معترضین اسلام پر کیا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ مشہور ان کے وہ جوابات ہیں جو انہوں نے فرانس کے وزیر خارجہ جبرئیل ہونیٹو اور الجامعہ کے مدیر فرح انطون کی تحریروں پر شائع کیے تھے اِن پُرجوش اور چبھتے ہوئے جوابوں نے محمد عبدہٗ کی شہرت پوری دنیائے اسلام میں پھیلا دی اور ان کا شمار اسلام کے قابل ترین مفسروں میں ہونے لگا۔

ہونیٹو (HANOTAUX) کا مضمون ۱۹۰۰ء میں جرنل ڈی پیرس میں شائع ہوا تھا اور اس کا عنوان تھا "اسلام اور مسلمانوں کا مسئلہ"۔ المؤید میں اس مضمون کا عربی ترجمہ شائع ہوا۔ مصنف کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ حکومت فرانس کو اُن اختلافات کی طرف متوجہ کرے جو اس کی مسلمان رعایا اور عیسائی حکمران قوم کے خیالات و عقائد میں نمایاں تھے۔ اور حکومت کو یہ مشورہ دے کہ وہ ایک مختصر یادداشت مرتب کرے جس میں اُن اصولوں کی صراحت کی جائے جو حکومت فرانس اور اس کی مسلمان رعایا کے تعلقات کو متعین کریں گے۔ عیسائی مذہب اور اسلام کے تضاد کو ظاہر کرنے کی غرض سے اس نے مذہب کے دو بنیادی مسائل کو اپنی بحث کا موضوع قرار دیا یعنی فطرتِ الٰہی اور جبر و اختیار کا مسئلہ۔ اس نے اِس بات پر زور دیا کہ تصوّرِ الوہیت کی نسبت عیسائیوں کا یہ اعتقاد کہ خداوند تعالیٰ انسانی شکل و صورت میں مجسّم ہو سکتا ہے اور انسان کے دکھ درد میں عملاً شریک بھی ہوتا ہے یعنی عقیدۂ تثلیث

ایک ایسا عقیدہ ہے جس سے انسان کی عظمت اور خداوند تعالیٰ سے اس کی قربت ظاہر ہوتی ہے اس کے برخلاف وحدانیت کا عقیدہ اور تقدیر پر اعتقاد جس پر سب مسلمان متفق ہیں، انسان کی تحقیر و تذلیل کا موجب ہے۔ اور اس کے احساسِ عجز و بے چارگی کو تقویت دینے والا ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کا یہ اعتقاد کہ انسان اپنے ارادہ اور عمل میں آزاد ہے انسان کی عملی قوتوں کے لیے ایک تازیانہ اور اس کی خود اعتمادی کے لیے ایک مضبوط اور مستحکم بنیاد ہے۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کو تقدیر پر بھروسہ ہے اور اس وجہ سے وہ اپنے تئیں نامعلوم قوتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔

محمد عبدُہ نے اپنے جواب میں ہونیٹو پر اعتراض کیا کہ اس نے تاریخ کا مطالعہ گہری نظر سے نہیں کیا ہے۔ یورپ کی موجودہ تہذیب کو ابتدائی آریا نسل کے تہذیبی سرچشمہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یونانیوں نے جنہیں ہونیٹو یورپ کا معلّم کہتا ہے اپنی تہذیب سامی اقوام سے حاصل کی ہے۔ جس زمانہ میں یورپ میں قتل و ہلاکت اور خونریزی کی تہذیب کے سوا اور کسی تہذیب کا پتہ تک نہ تھا مسلمان یورپ میں داخل ہوئے اور یونانیوں، مصریوں اور رومیوں کے علوم و فنون اور اُن کی ترقیات اپنے ساتھ لائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر قوم دوسری قوموں سے ضرورت کے موافق کچھ نہ کچھ اخذ کرتی ہے اور مغربی آریائی قوموں نے اپنے زوال و انحطاط کے دَور میں مشرقی سامی قوموں سے اس سے کہیں زیادہ اخذ کیا جتنا کہ آج روبزوال مشرق مغرب سے اخذ کر رہا ہے۔

محمد عبدُہ نے بتایا کہ خدا کی وحدانیت کا اعتقاد سامی الاصل نہیں ہے بلکہ اس کی ابتدا عبرانیوں سے ہوئی۔ پھر تقدیر کا مسئلہ کسی ایک مذہب تک محدود نہیں ہے۔ خود عیسائیوں میں اس مسئلہ کی بابت مختلف فرقوں میں بے حد اختلاف ہے۔ قرآن جبر سے انکار کرتا ہے اور

اس میں چھیالیس آیات ایسی ہیں جس میں سعی و عمل کی ترغیب دی گئی ہے اور انسانی ارادہ کی آزادی کا اثبات کیا گیا ہے۔ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ پیغمبر اسلام اور اُن کے رفقاء اور اصحاب نے ایک مختصر سی مدت میں دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اسلام کا سکہ جما دیا۔ یہ صحیح ہے کہ بعد میں بے عملی اور جمود کے افسون نے عالم اسلام کو متاثر کر دیا لیکن یہ صوفیاء کی تعلیم کا نتیجہ تھا اور تصوّف کی اشاعت کا پھل تھا جسے اسلام سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا کیونکہ تصوف کا مولد و منشاء ایران تھا اور صوفیانہ عقائد و افکار بھی ایرانی الاصل تھے۔

خدا کی وحدانیت اور اس کی ماورائیت کے اعتقاد پر بحث کرتے ہوئے محمد عبدہ نے مختلف قوموں کے عقائد اور اُن کی زندگی پر ان عقائد کے نتائج و اثرات کی مثالیں دے کر اس کا ناقابل انکار ثبوت پیش کیا کہ یہ عقیدہ انسانی فکر و تعقل کی اعلیٰ ترین فتوحات میں سے ہے اور اس کی بنیاد سراسر عقلی ہے بر خلاف اس کے تثلیث کے عقیدہ میں خود عیسائیوں کے اقوال کے مطابق عقل و فکر کو کوئی دخل نہیں ہے۔ قسطنطین کے عہد حکومت تک عیسائی مذہب کی ساری طاقت اور یورپ کی غیر عیسائی قوموں کے لیے اس کی زبردست اپیل اس بات میں تھی کہ عیسائیت ذات ایزدی کی ماورائیت (TRANSCENDENCE) پر زور دیتی تھی۔ تثلیث کا اعتقاد تو قسطنطین کے عہد کے بعد کی پیداوار ہے اور اسی عقیدہ کی بدولت مغربی زندگی میں لاتعداد برائیاں جڑ پکڑ گئیں جو دَورِ اصلاحات تک زائل نہ ہو سکیں۔

جب محمد عبدُہ کا یہ جواب شائع ہوا تو مصر کے اخبار الاہرام نے ہونیٹو (HANOTEAUX) کی حمایت میں ایک مقالہ سپرد قلم کیا اور یہ ثابت کیا کہ ہونیٹو کے مضمون کا ترجمہ اغلاط سے پُر تھا پھر جب ہونیٹو نے محمد عبدُہ کا مضمون الاہرام کے فرانسیسی اڈیشن میں پڑھا تو اس نے جرنل ڈی پیرس (JOURNAL DE PARIS) میں ایک اور مضمون شائع کیا جس کا ترجمہ الاہرام

نے مصر میں ۱۲ مئی سن ۱۹۰۰ء میں چھاپا۔ اس میں ہونیٹو نے بیان کیا کہ اس کے سابقہ مضمون کی اشاعت سے یہ مقصود نہ تھا کہ مذہب اسلام کو نیچا دکھایا جائے اور عیسائیت کی برتری ثابت کی جائے بلکہ اس کی اشاعت کی غرض یہ تھی کہ فرانسیسی حکمرانوں اور ان کی مسلمان رعایا میں باہمی مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ ان کے تعلقات زیادہ خوشگوار ہوجائیں اور وہ ایک دوسرے کو عزت واحترام کی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ اس کے بعد جب الاھرام کا مدیر پیرس گیا تو وہاں اس نے ہونیٹو سے ملاقات کی اور اس ملاقات کی ایک مختصر یادداشت ۱۶ جولائی سن ۱۹۰۰ء میں شائع کی۔ اس میں پھر ہونیٹو نے اسلام پر حملہ کرنے کے الزام سے اپنی بریت کا ثبوت دیا تھا لیکن اس نے یہ ضرور کہا کہ مشرق ابھی تک عدل وانصاف اور تہذیب وتمدن کے لحاظ سے اتنا ترقی یافتہ نہیں ہے جتنا ترقی یافتہ مغرب ہے۔ اس نے اپنے اس یقین کا بھی اظہار کیا کہ جب تک مسلمانوں میں ریاست ومذہب کا موجودہ اتحاد باقی ہے اس وقت تک ترقی کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی ہے۔ یورپ نے بڑے تلخ تجربات کے بعد ان دونوں کی علیحدگی کا سبق سیکھا ہے۔

اس کے جواب میں محمد عبدہ نے المؤید میں تین مضامین شائع کیے۔ انھوں نے مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ ہونیٹو کی تنقیدوں سے سبق حاصل کریں اور ہونیٹو نے ان کی جن کمزوریوں اور خرابیوں کو طشت از بام کیا ہے ان کو دفع کریں اور ان پر غالب آنے کی کوشش کریں تاکہ وہ ترقی کی دوڑ میں مغرب سے کامیاب مقابلہ کرسکیں۔ انھوں نے بتایا کہ پان اسلامزم یا اتحاد اسلامی کی تحریک جس کی طرف ہونیٹو نے اپنے مضمون میں اشارہ کیا ہے کوئی سیاسی تحریک نہیں ہے بلکہ یہ تحریک خالص مذہبی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان اپنی اصلاح کے لیے اس ایک راستہ پر قدم زن ہوجائیں جو ان کی اصلاح کی واحد راہ ہے اور یہ راہ سچی مذہبیت کی راہ ہے۔ انھوں نے ان تمام کمزوریوں اور خرابیوں کا کھلے دل

سے اعتراف کیا جن کو دور کرنا اتحاد اسلامی کی تحریک کا اوّلین مقصد تھا انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ اگر موجودہ اسلامی حکمران مذہب اور سیاست دونوں کی نمائندگی کرتے تو اُن کے لیے ناممکن ہوتا کہ وہ ظلم وستم اور اسراف کر کے مذہبی اصولوں کی اس طرح کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے جیسے کہ وہ آج کر رہے ہیں اور جس کی وجہ سے اسلامی ممالک پر فلاکت واد بار چھا گیا ہے اور وہ اپنی عزیز ترین متاع یعنی آزادی اور خود مختاری سے محروم ہو گئے ہیں۔

محمد عبدُہ کا دوسرا مضمون جو انہوں نے اسلام کی مدافعت میں لکھا تھا اُس مقالہ کا جواب تھا جو الجامعہ کے عیسائی اڈیٹر نے ابن رشد پر لکھا تھا۔ دورانِ بحث میں مدیر الجامعہ نے علم وفضل اور حکمت وفلسفہ کی نسبت اسلام اور عیسائیت کے طرزِ عمل کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا تھا کہ عیسائیت نے بمقابلہ اسلام کے مفکرین اور فلاسفہ کے ساتھ زیادہ رواداری کا برتاؤ کیا ہے اور نسبتہً اُن پر کم ظلم وستم ڈھائے ہیں۔ اس کی وجہ اُس نے یہ ظاہر کی تھی کہ اسلام میں دینی اور دنیوی اقتدار ایک ہی جگہ مرتکز ہے جس کی وجہ سے رواداری کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ عیسائی یورپ میں علم وفضل اور فلسفہ وسائنس ان تمام مخالفتوں اور دشواریوں پر غالب آگئے جن کا انہیں سامنا کرنا پڑا۔ اس کے برخلاف اسلامی دنیا میں آج تک علم وفلسفہ مغلوب ومقہور ہیں۔ اس مضمون میں مسلمان فلاسفہ کی جانب عِللِ ثانوی (SECONDARY CAUSES) کی اثر پذیری کا انکار منسوب کیا گیا تھا اور ابنِ رشد کو ملحد بھی قرار دیا گیا تھا محمد عبدہ نے اپنے جواب میں چار چیزوں پر بحث کی

اوّل اس الزام کے جواب میں کہ مسلمانوں نے غیر مسلم علماء اور فلاسفہ کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا ہے انہوں نے خود غیر مسلم مؤرخین کی شہادتوں سے اس الزام کو رفع کیا۔ دوم انہوں نے اس دعویٰ کو غلط ثابت کیا کہ اسلامی فرقے ہمیشہ مذہبی مسائل کے متعلق آپس میں دست وگریبان رہے ہیں۔

سوم الجامعہ کے اڈیٹر نے اپنے مقالہ میں لکھا تھا کہ مذہب اسلام کی فطرت ہی میں ناراواداری اور

علم و ہنر سے بیزاری کے عناصر موجود ہیں۔ اس کے برخلاف عیسائیت فکری آزادی کی حامی ہے اور اس نے ہمیشہ علم و فضل کی سرپرستی کی ہے۔ اس پر محمد عبدہ نے تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان دونوں مذاہب کی فطرت ان کے رجحانات اور ان رجحانات کے نتائج کا فرق واضح کرتے ہیں۔ چہارم اس دعوے کے جواب میں کہ عیسائیت کی رواداری کی برکات کی وجہ سے اہل مغرب ترقی اور تمدن کے اس اعلیٰ مرتبہ تک پہنچے ہیں محمد عبدہ تاریخ سے اس امر کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ عیسائی مذہب نے نہ صرف دوسرے مذاہب کے علماء اور فلاسفہ کی فکری آزادی کو پامال ستم کیا بلکہ خود عیسائی مفکرین اس کی سخت گیریوں اور ستم رانیوں سے نالاں اور شاکی رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ اسلام نے علم و فضل اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور مسلمان بادشاہوں نے ہمیشہ علماء اور فلاسفہ کی سرپرستی کی ہے پھر محمد عبدہ ان اسباب پر نظر ڈالتے ہیں جنہوں نے موجودہ زمانے میں اسلامی نظام کو اس قدر بے لوچ بنا دیا ہے اور اس ناخوش گوار تبدیلی کے مضر نتائج کی صراحت کرتے ہیں اور مادہ اور حیات کے متعلق ابن رشد اور دیگر اسلامی مفکرین کے نظریات کی وضاحت کرتے ہیں۔

ناتمام ارادے | جامعہ ازہر کی انتظامی کمیٹی سے محمد عبدہ کے مستعفی ہو جانے کی وجہ سے ان کے اکثر ارادے ناتمام رہ گئے۔ انہوں نے شیخ الازہر کی یہ تجویز قبول کر لی تھی کہ وہ ازہر میں تاریخ اسلام پر لکچر دیں اور اس مضمون پر ایک کتاب جدید طرز کی کتاب تصنیف کریں۔ لیکن جب ازہر سے ان کا تعلق منقطع ہو گیا تو یہ تجویز بھی تشنہ تکمیل رہ گئی۔ اس کے علاوہ جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ان مخالفتوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے جو اس وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں کہ وہ جامعہ ازہر کو عالم اسلامی کی اصلاح کا مرکز بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے

سب سے پہلے خود جامعہ ازہر کی اصلاح کرنا چاہتے تھے تو انھوں نے اپنی اس ناکامی پر صبر کر لیا۔ اس کے بعد اسی مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے ایک نئے ادارہ کی بنا ڈالنی چاہی اس کے لیے ملک کے ایک بڑے امیر و کبیر شخص نے جو اس تجویز کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا اپنی زمین کا ایک قطعہ بھی وقف کر دیا تھا اور مجوزہ ادارہ کا خاکہ بھی تیار ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن ان کی موت کی وجہ سے یہ تجویز عملی شکل نہ اختیار کر سکی۔ قرآن مجید کی وہ تفسیر بھی نامکمل رہ گئی جو انھوں نے کچھ عرصہ قبل لکھنا شروع کی تھی۔

ایک اور تجویز بھی ان کے ذہن میں تھی اور وہ یہ تھی کہ ایک کمپنی اس غرض سے بنائی جائے کہ وہ ایک عربی روزنامہ کی اشاعت کا انتظام کرے جو ادبی لحاظ سے اپنا آپ نمونہ ہو اور جس کی مجلس ادارت قابل ترین افراد پر مشتمل ہو۔ اس روزنامہ کے ذریعہ محمد عبدہ ملک اور اہل ملک کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور اس غرض سے اُسے سیاسی خبروں سے پاک رکھنا چاہتے تھے لیکن موت نے اس ارادہ کو بھی پورا نہ ہونے دیا وہ مشرقی ممالک کے سفر کا بھی ارادہ کر رہے تھے تاکہ ایران، افغانستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کی صحیح حالت کا اندازہ کر سکیں جس طرح کہ مغربی ممالک کے مسلمانوں کی صحیح حالت کا انھیں اندازہ تھا۔

علالت اور موت | ان کی آخری علالت کا سلسلہ جو ان کی موت پر منتہی ہوا ان کے ایک دوست محمد بے کے مکان سے شروع ہوا جہاں وہ اُس زمانہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ صاحب اسکندریہ سے قریب ایک قریہ میں سکونت پذیر تھے۔ (ان کا مرض بہت پرانا تھا اگرچہ اُس کے مہلک ہونے کا اندیشہ کسی کو نہ تھا لیکن ان کی حالت بڑھتی گئی یہاں تک کہ جمعرات کے روز گیارہ جولائی ۱۹۰۵ء کو انھوں نے اس عالم فانی کو الوداع کہا)۔

دوسرے روز اُن کا جنازہ جس کے پیچھے ہزاروں لوگ زار و قطار رو رہے تھے اسٹیشن پر لایا گیا

وہاں سے ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعہ ان کی نعش قاہرہ آئی۔ راستہ میں اہم مقامات پہ ریل روک لی جاتی تھی تاکہ ان کے ہم وطنوں کا اجتماع ان کا آخری دیدار کر سکے۔

قاہرہ میں اسکندریہ کے مجمع سے کئی گنا زیادہ مجمع ان کے جنازہ کو نماز کے لیے مسجد ازھر پہنچانے کے لیے موجود تھا۔ اس مجمع میں حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار غیر ممالک کے سفرا اور پولیس کے دستے علماء اور اہل قلم حضرات کی ایک کثیر تعداد ازھر کے طلبا کی کئی ٹولیاں غرضکہ ہر فرقہ جماعت اور مشرب کے لوگ شریک تھے۔ مسجد میں نماز کے بعد محمد عبدہ کے مناقب و فضائل پہ ایک جملہ بھی نہیں کہا گیا کیونکہ خود محمد عبدہ نے اپنی زندگی میں اس رسم کو مٹا دیا تھا۔ نماز کے بعد یہ پورا مجمع جنازہ کے ساتھ قبرستان گیا۔ جہاں محمد عبدہ کے جسم فانی کو ہمیشہ کے لیے سپرد خاک کر دیا گیا۔ حسن پاشا نے مجمع کو منتشر ہو جانے کا حکم دیا اور اس کی بہ فضیلت کی تعریف میں کسی کو ایک لفظ تک کہنے کی اجازت نہیں ملی۔ موت کے چالیس دن بعد رواج کے مطابق دعاء مغفرت کے لیے لوگ پھر قبرستان میں جمع ہوئے اس مرتبہ مجمع اور زیادہ تھا۔ چھ مقررین منتخب کیے گئے جنہیں محمد عبدہ سے خاص تعلق تھا اور جو ان کے مقاصد اور خیالات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ان مقرروں نے ان کے حالات زندگی بیان کیے اور ان کے کارناموں کی تعریف و توصیف کی۔ اس کے بعد مجمع منتشر ہو گیا۔

سیرت و کردار | محمد عبدہ کی وفات کے بعد وہ تمام نکتہ چینیاں، اعتراضات، پرجوش مخالفتیں اور خفیہ سازشیں جو زندگی بھر ان کی شخصیت کو گھیرے ہوئے تھیں اور جو ان کی عمر کے آخری دو سالوں میں اور بڑھ گئی تھیں دفعتہً سرد پڑ گئیں ملک و قوم اور اصلاح مذہب کی تحریک کو ان کی موت سے جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اس کی یاد بہت دنوں تک فراموش نہ کی جا سکی۔ ہر مذہب فرقہ اور جماعت کے لوگوں نے باہمی اختلافات کے باوجود متفقہ طور سے اس محب وطن اس یگانہ

روزگار شخصیت اور اس باہمت مصلح و رہنما کے کارناموں کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

(بلاشبہ محمد عبدہ کی ذات میں قیادت و رہنمائی کے لیے جتنی خصوصیات ضروری ہیں سب کی سب موجود تھیں جسمانی لحاظ سے وہ توانا اور تندرست تھے اگرچہ قدآور نہ تھے۔ داڑھی گھنی اور آواز پاٹ دار تھی۔ مزاج کے البتہ وہ تیز تھے۔ ان کی تقریر میں روانی اور برجستگی ہوتی تھی اور ان کی زبان تحریر و تقریر دونوں میں فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا حافظہ قوی اور قوت استدلال نہایت زبردست تھی۔ وہ غیر معمولی محنت و مشقت کے عادی تھے اور جیسا کہ ان کی زندگی کے مختلف ادوار سے ظاہر ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی عملی اور انتظامی صلاحیتوں کے بھی مالک تھے۔ علم و فضل میں جو درجہ کمال انہیں حاصل تھا اس کی وجہ سے ان کا شمار اپنے زمانہ کے بڑے بڑے علماء میں ہوتا تھا اور اسلامی دنیا میں اسی وجہ سے انہیں ایک مخصوص حیثیت حاصل تھی اسلامی علوم کی کوئی شاخ ایسی نہیں تھی جس میں انہیں معمولی سے زیادہ درک نہیں حاصل تھا۔ فلسفہ دینیات، فقہ، حدیث اور دیگر علوم میں ان کا فضل و کمال مسلّم تھا۔ عربی ادب سے ان کی واقفیت بہت وسیع تھی اور اس ادب کے وسیع مطالعہ سے ان کا انداز تحریر و تقریر ایک خاص سانچہ میں ڈھل گیا تھا جس سے انہوں نے اپنے علمی اور تعلیمی کاموں میں بہت فائدہ اٹھایا۔ تاریخ اسلام سے انہیں غیر معمولی دلچسپی تھی)۔ انہوں نے ابن خلدون کی تاریخ کا نہ صرف مطالعہ کیا اور اُس پہ تبصرہ لکھا بلکہ اپنی تصنیف رسالۃ التوحید کے تمہیدی حصہ میں انہوں نے اسلام کے نشو و ارتقاء پر ایک مستقل مقالہ بھی سپرد قلم کیا جس میں انہوں نے ایسی اصابت رائے اور صحت فکر کا ثبوت دیا جو عام طور سے مشرقی مورخین میں کم پائی جاتی ہے۔ اپنی فلسفیانہ تصانیف میں بقول پروفیسر ہارٹن (PROF HORTEN) نہ وہ ابن رشد کی سی گہرائی پیدا کر سکے اور نہ کسی بڑے فلسفی کی سی بلند پروازی دکھا سکے۔ اس کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے جیسا کہ پروفیسر مذکور کو خود اقرار

ہے کہ جہاں تک اُن کی اُس کوشش کا تعلق ہے جو انہوں نے اسلام کے روائتی اور قدیم فلسفہ کی جگہ ایک نئے اسلامی فلسفہ کی تعمیر اور اسلامی فقہ اور شریعت کے قوانین کو زمانہ حال کے مزاج و حکم سے مطابقت دینے کے لیے کی تھی کہ انہوں نے وہ سب کچھ کر لیا جو اُن ناموافق حالات میں کسی انسانی ذہن کے لیے ممکن تھا۔

(مغربی علوم کی مختلف شاخوں سے بھی وہ کچھ کم واقفیت نہ رکھتے تھے اگرچہ اس باب باب میں انہوں نے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ تراجم کے ذریعہ حاصل کیا تھا چالیس سال کی عمر میں انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی تاکہ فرانسیسی زبان کا علم انہیں براہ راست حاصل ہو جائے۔ اس کے بعد پھر وہ فرانسیسی زبان کی کتابوں کا مطالعہ لگاتار کرتے رہے تاریخ اخلاقیات فلسفہ اور فن تعلیم سے انہیں زیادہ دلچسپی تھی} وہ مشہور فلسفی ہربرٹ سپنسر (HARBERT SPENCER) کے بڑے مداح تھے۔ اور اُن سے انگلستان میں ملاقات بھی کی تھی۔ ان کی کتاب (ON EDUCATION) کا ترجمہ بھی انہوں نے فرانسیسی زبان سے عربی میں کیا تھا اور اس کتاب کے ترجمہ سے ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعہ انہیں مصر کے مدارس اور خصوصاً جامعہ ازھر کی اصلاح میں مدد ملے۔ اسی طرح وہ روسی ادیب ٹالسٹائی سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے اور جب روسی کلیسا نے ٹالسٹائی پر کفر کا فتویٰ دیا تو انہوں نے ٹالسٹائی کو ایک خط بھی لکھا۔

(جو شخص محمد عبدہ سے ایک بار بھی ملا وہ اُن کی سیرت کی پختگی اور کردار کی بلندی کا گہرا نقش لے کر واپس ہوا اُن کی رفتار و گفتار اور وضع قطع سے ایک فطری تمکنت ظاہر ہوتی تھی۔ اور چونکہ وہ بڑے سے بڑے مقتدر اور با اثر شخص کے ساتھ بھی عاجزی یا خوشامد سے پیش نہیں آتے تھے اس لیے بعض دفعہ اُن پر مغرور اور بد دماغ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا لیکن حقیقتاً وہ بڑے متواضع اور منکسر المزاج تھے جیسا کہ دوستوں اور طلباء کے ساتھ ان کے برتاؤ اور طرز تخاطب سے صاف معلوم

ہوتا تھا۔ اپنے مخالفین اور بدخواہوں کے ساتھ بھی وہ بڑی کشادہ دلی کے ساتھ پیش آتے تھے لیکن کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ اپنے دوستوں پر انہیں بڑا اعتبار تھا اور اس میں بعض دفعہ وہ اتنا غلو کرتے تھے کہ اس کی وجہ سے انہیں طرح طرح کے خطرات کا سامنا کرنا پڑ جاتا تھا۔ غریبوں اور حاجتمندوں کے لیے وہ بڑے فیاض تھے یہاں تک کہ ان کی فیاضی ضرب المثل ہو گئی اور انہیں بدنصیبوں کا سرپرست کہا جانے لگا۔ ان کا مکان واقعی بدنصیب لوگوں اور ستم زدہ افراد کے لیے ایک جائے پناہ بن گیا تھا۔ اُن کے دروازہ پر اکثر اوقات حاجت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی خصوصاً ازھر کے نادار طلباء کے لیے اُن کی آمدنی کا ایک حصہ وقف تھا اور ان کے حسابات میں وہ ماہانہ امداد بھی شامل رہا کرتی تھی جو وہ ازھر کے بعض غیر مستطیع طلباء کو دیتے تھے۔ اپنے قول کے بڑے سچے تھے اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ ان کی کسی بات میں مبالغہ کا شائبہ نہ ہو۔ ہر معاملہ میں بڑے غور و خوض کے بعد وہ فیصلہ کرتے تھے لیکن جب فیصلہ کر لیتے تو اس پر مضبوطی سے قائم رہتے۔ فکر و عمل کی آزادی ان کا ایک امتیازی وصف تھا مگر یہ نہ تھا کہ وہ کسی سے مشورہ نہ لیتے ہوں جب کبھی ضرورت محسوس کرتے دوسروں سے مشورہ اور امداد طلب کرتے لیکن ان کی وہ صفت جس نے جریدہ عالم پر ان کا دوام ثبت کر دیا اور جو ان کی شخصیت کا اعلیٰ ترین جوہر تھی ان کی بے مثال اخلاقی جرأت تھی۔ ایک عربی اخبار نے ان کی موت کے بعد لکھا: "مشرق کے سب سے بڑے مرکز میں اس ملک میں جو تخویف ظلم اور جابرانہ ملوکیت کا محفوظ ترین نشیمن تھا یہ باہمت اور جراں مرد شخص ہر بات میں اپنی غیر پابند اور آزاد رائے کا علی الاعلان اظہار کرتا تھا اور اس پر ثابت قدمی کے ساتھ جما رہتا تھا بغیر اس خوف کے ارباب مقتدر اور اعیان سلطنت پر اس کا کیا اثر پڑے گا" حالانکہ اس حق پرستی اور آزادیٔ رائے کی وجہ سے انہیں متعدد آزمائشوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

اسلام اور اس کے نصب العین زندگی کے ساتھ عقیدت ان کے تمام اعمالِ حیات کا سرچشمہ

تھی۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ اسلامی نظام کی کامل اصلاح ہی (جو درحقیقت صدر اول کے اسلامی نظام کی طرف رجعت کے مترادف تھی) سے مسلمان وقت اور ماحول کے مطالبات کو پورا کر سکیں گے اس مقصد کے حصول میں ان کا رہوار عمل ہر ٹھوکر پر ایک نیا تازیانہ کھاتا تھا۔ وہ کہتے تھے "میں موت کے سوا اور کسی شئے سے نہیں ڈرتا ہوں اور اس سے بھی صرف اس لیے خائف رہتا ہوں کہ میرا مقصد ناتمام رہ جائے گا" جب ان کے دوست انہیں مشورہ دیتے تھے کہ تم ان ذمہ دار خدمتوں سے سبکدوش ہو جاؤ جہاں شبانہ روز کی محنت کے بعد تمہیں صرف یہ صلہ ملتا ہے کہ مخالفین تلخ تنقیدیں کرتے ہیں اور تمہیں اپنے ناروا حملوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس کے بجائے تم عدالت مرافعہ میں اپنی پرانی خدمت پر واپس چلے جاؤ جہاں کام کم اور تنخواہ زیادہ ہے تو وہ ہنس کر ان کی باتوں کو ٹال دیتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس طوفان بدتمیزی کے باوجود جو ان کے خلاف برپا تھا ان کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ان کا وہاں رہنا ضروری تھا۔ ان کے ایک دوست لکھتے ہیں "میں اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان کے لیے ناممکن تھا کہ وہ جس قسم کی زندگی بسر کر رہے تھے اسے خیرباد کہہ دیتے" کبھی کبھی وہ راتوں کو نیند سے بیدار ہو جاتے تھے اور گھنٹوں اس پر غور کیا کرتے کہ مسلمانوں کی پستی رفع کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اسلام اور مسلمانوں سے گہری وابستگی کے ساتھ انہیں قوم و ملک سے بھی سچی محبت تھی اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ قوم و ملک سے محبت ان کے لیے درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کی محبت کے ہم معنی تھی۔ ان کی تمام سرگرمیوں میں جو چیز ان کا سب سے بڑا سہارا تھی وہ یہ غیر منقطع امید تھی کہ ان کی کوششیں ضرور سرسبز و بارآور ہوں گی۔ اس یقین و امید کی روشنی میں تمام پریشانیاں فکریں اور مایوسیاں ان کی نظروں سے غائب ہو جاتی تھیں۔ اصلاح قوم کی امید نے ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا کیونکہ ان کو پختہ یقین تھا کہ اصلاح کا بیج ایک ایسی سرزمین میں بویا جا رہا ہے جو اسے اپنی

آغوش میں لینے کے لیے بالکل تیار ہے۔ اور یہ بیج اسی طرح بار آور ہو گا جس طرح کہ خرابی کے بیج پہلے بوئے گئے تھے اور ان سے بڑے بڑے تناور درخت پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے انہوں نے زندگی بھر کی کمائی خیالات و عزائم کے ان نئے بیجوں کے بونے میں صرف کر دی۔

جب انہوں نے تحریک اصلاح شروع کی تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کے ہم وطن دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک طرف وہ قدامت پرست گروہ تھا جو ہر قسم کی تبدیلی اور جدت کا مخالف تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں گزشتہ زمانہ سے جو کچھ ملا ہے اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ ایک مقدس امانت ہے جسے اپنی جگہ پر محفوظ رکھنا چاہیے۔ اس گروہ کے نمائندے زیادہ تر ازہر کے شیوخ اور علماء اور ان کے متبعین تھے۔ دوسری طرف ایک تجدد پسند جماعت تھی جو زیادہ تر ایسے افراد پر مشتمل تھی جنہوں نے جدید طرز پر تعلیم پائی تھی اور جن کا خیال تھا کہ ماضی سے یہ گہری وابستگی فکر و خیال کی آزادی کے لیے سمِ قاتل ہے اور اس کی وجہ سے ترقی کا ہر اقدام اور اصلاح کی ہر تحریک ناکام و نامراد رہتی ہے۔ محمد عبدہ ایک معنی کر کے ان دونوں جماعتوں میں شامل تھے اور دونوں کے سرگروہ تھے۔ قدامت پرست ان کے علم و فضل اور ان کی اسلامی حمیت کا احترام کرتے تھے اگرچہ ان کی تجدد پسندی سے ناراض تھے۔ ترقی پسند طبقہ انہیں اپنا سب سے بڑا رہنما اور قائد خیال کرتا تھا اور ان کے اصولوں میں ایک درخشاں مستقبل کی روشنی دیکھتا تھا لیکن ان کے مخالفین سب قدامت پرست نہ تھے بعض ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی اپنی جگہ بڑے اثر و اقتدار کے مالک تھے اور محمد عبدہ کی سرگرمیوں اور کوششوں میں انہیں اپنے اثر و اقتدار کے زوال کا چہرہ نظر آتا تھا۔ بعض لوگ اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر ان کے دشمن تھے۔ وہ لوگ جو اسلامی ممالک کو ایک واحد حکمراں کے تحت ایک ہی سیاسی وحدت میں منسلک دیکھنے کے آرزو مند تھے اس بات سے خوف زدہ تھے کہ کہیں غیر مسلم

اقوام اور مغربی ممالک سے میل جول کا نتیجہ اس تخیل کی بارآوری میں رکاوٹ نہ بن جائے لیکن ان کے مخالفین میں سب سے زیادہ تعداد انہیں لوگوں کی تھی جو یا تو جہالت یا فطری میلان طبع کے سبب سے قدامت پرست تھے اور قدماء کے افکار و تخیلات سے سرمو انحراف کو خدا اور رسول کے احکام سے انحراف کے ہم معنی سمجھتے تھے وہ کہتے تھے یہ شیخ کیسا ہے جو فرانسیسی زبان بولتا ہے یورپ کا سفر کرتا ہے مغربی تصانیف کا حوالہ دیتا ہے اور ان کا ترجمہ اپنی مقدس زبان میں کرتا ہے جو بڑے بڑے علماء سے اختلاف کرتا ہے اور ایسے ایسے فتوے دیتا ہے جو آج تک کسی نے نہیں دیے۔ یہی لوگ عوام کے ذہن میں ان کی مخالفت کا زہر اتارتے تھے اور بے سمجھ عوام جو ان کے مقاصد زندگی کو سمجھنے کی اہلیت سے محروم تھے ان افترا پردازوں کے دہوکہ میں آکر انہیں ملحد اور بے دین کہتے تھے۔

اگرچہ عام طور سے تجدد پسند طبقہ ان کی ہدائت و رہنمائی پر عامل تھا لیکن اس میں بعض افراد ایسے بھی تھے جو انقلاب کو اور زیادہ تیز رفتار کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ وہ تھے جو یہ چاہتے تھے کہ مغربی تمدن بتمام و کمال اپنی ساری رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ سرزمین مصر پر اتر آئے اور مغربی زندگی کے تمام تکلفات مصر میں گھر کر جائیں۔ ان لوگوں پر محمد عبدہ نے ابتدا میں بہت سخت تنقید کی تھی اور ان کے متعلق انہوں نے کہا تھا کہ یہ لوگ قومی ترقی کے متعلق بہت سطح بینی سے کام لے رہے ہیں۔ اس طرح محمد عبدہ اور ان کے ساتھی دو مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ لارڈ کرومر لکھتے ہیں کہ دوسری جماعت اتنی آزاد خیال تھی کہ قدامت پرست مسلمانوں کو اپنے ساتھ نہیں لے سکتی تھی۔ نہ تو ان میں اتنی مغربیت تھی کہ وہ ہو بہو مغربی زندگی کی نقل اتار سکتے اور نہ وہ مشرقی تمدن کی خصوصیات کے حامل تھے۔ اگرچہ محمد عبدہ کے حامیوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن ترقی اور اصلاح کا جذبہ ان

کے دلوں میں موج زن تھا وہ کہیں زیادہ تیز اور احاطہ کن تھا۔ خود جامعہ ازہر میں ایسے لوگ تھے جو اصلاح کی ضرورت کے قائل تھے اور اُن کی مساعی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے ازھر سے باہر اس سے بھی زیادہ تعداد میں لوگ دل ہی دل میں اُن سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن وہی کمزور خیالی اور آزادانہ اظہار رائے کا خوف وہی بے عملی اور اخلاقی جرأت کی کمی جو ازھر میں محمد عبدہ کے حامیوں کو اُن سے تعاون نہیں کرنے دیتی تھی ازھر سے باہر بھی ان کے ہم خیالوں کو گونگا اور اپاہج بنائے ہوئے تھی۔ اس کے برخلاف ان کے مخالفین کا شور و غوغا بڑھتا ہی گیا اور ان کے دشمنوں کے فتنہ خیز عزائم شر انگیزی سے باز نہ آسکے۔ دوستوں کی کمزوری اور مرعوبیت مخالفین کی جرأت اور بے خوفی۔ اُن کی راہ میں یہی دو بڑی روکاوٹیں تھیں۔

ان کی شہرت و نام آوری کا دائرہ صرف سرزمین مصر تک ہی محدود نہ تھا۔ دیگر اسلامی ممالک کے بسنے والے مسلمان بھی ان کی اسلامی خدمات کی شہرت سے متاثر ہوکر خطوط کے ذریعہ مذہبی، قانونی اور معاشرتی امور میں اُن سے استفتا کرتے تھے یا اور طریقوں سے ان کے علم و فضل سے منفعت پذیر ہوتے تھے۔ ان امور سے متعلق ہندوستان سے لے کر مراقش تک جملہ اسلامی ممالک کے علماء، بادشاہوں اور عہدہ داروں سے ان کی خط و کتابت تھی۔ اسلامی ممالک میں ان کے نام کا کتنا اثر تھا یہ صرف اس واقعہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کی موت کے بعد شام اور ترکی میں اخباروں کو ممانعت کر دی گئی کہ نہ تو وہ ان کی موت کی اطلاع شائع کریں اور نہ اپنے کسی اداریہ یا مضمون میں اُن کی ثنا و صفت بیان کریں۔ اُن کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے تو ان کا نام زبان پہ لانا بھی مستوجب سزا خیال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اُن کے نام کے ساتھ تحریک اصلاح کا تذکرہ آنا بھی ضروری تھا۔ شام

ہندوستان، بحرین، سنگاپور، جاوا، روس، ایران، تیونس، الجیریا اور دیگر اسلامی ممالک سے جو تعزیتی پیامات ان کے اعزا اور دوستوں کو وصول ہوئے وہ اُن کی شہرت کی وسعت و گیرائی پر گواہ ہیں۔ اس دعویٰ کا مزید ثبوت اس امر سے فراہم ہوتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد اُن کے مختصر حالات زندگی اور ان کی بابت تعریفی مضامین نہ صرف اُن ممالک کے اخباروں میں شائع ہوئے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے بلکہ سان پاولو (SAN PAOLO) برازیل اور نیویارک کے عربی اخبارات میں بھی اس قسم کے کئی مضامین شائع ہوئے جن میں اُن کا اور علامہ جمال الدین کا تذکرہ مدحت پاشا اور فواد پاشا کے نام کے ساتھ آیا ہے۔ مغربی علما بھی ان کی تعریف و توصیف میں شریک تھے جیسا کہ علامہ جمال الدین افغانی کے سوانح نگار ای۔ جی۔ براؤن کے پیغام سے ظاہر ہے جس میں اس نے محمد عبدہ کی موت پہ ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے "علم و فضل میں تقویٰ اور ریاضت میں، دانشمندی، فصاحت اور خلائق کی نفع رسانی میں موجودہ زمانہ میں ان کا سا شخص نہ مغرب میں پیدا ہوا اور نہ مشرق میں"۔

ان کی تصانیف کے ترجمے اکثر زبانوں میں ہو چکے ہیں اور بعض میں ابھی ہو رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک میں ان کا اثر اب بھی قائم ہے۔ محمد رشید رضا کا بیان ہے کہ ان کی تصنیف رسالۃ التوحید (جس میں انہوں نے اپنے مذہبی اصول و عقائد کی توضیح کی ہے) کا ترجمہ اُردو زبان میں ہو چکا ہے اور یہ کتاب علی گڑھ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔ ڈاکٹر احمد محی الدین نے اپنی ایک کتاب میں (جو انہوں نے ترکی زبان میں تحریک تجدد پر تصنیف کی ہے) لکھا ہے کہ اُن کی تصانیف کے بعض حصوں کا ترجمہ عاکف نے ترکی زبان میں کیا ہے اور ڈاکٹر موصوف نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ترکی قوم پرستوں اور اصلاح پسندوں کے خیالات و افکار پہ محمد عبدہ کی تصانیف کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑا ہے۔

ایک ولندیزی فاضل ڈاکٹر کریمر جس نے ملایا کے مسلمانوں کی حالت کا خاص طور سے مطالعہ کیا ہے ایک جگہ لکھتا ہے :-

"محمد عبدہٗ کے افکار و نظریات جزائر شرق الہند میں اب نفوذ کر رہے ہیں۔ اُن کی تفسیر قرآن کا ترجمہ ملایا کی زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ جاگیبا میں محمدیہ فرقہ محمد عبدہٗ کے اسلام کی تبلیغ کر رہا ہے اگرچہ اس تبلیغ میں ان کا نام زبانوں پر نہیں آتا ہے۔ مغربیت کی ترقی یہاں علم و تعلیم کی اشاعت طبی امداد کی فراہمی اور نوجوانوں کے ذریعہ پروپیگنڈے کی شکل میں نمودار ہو رہی ہے۔ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں ان چیزوں کی محرک ہوئی ہیں۔ اور ترقی کی تمام کوششیں انہیں خطوط پر ہو رہی ہیں جن پر مشنریوں نے کام کیا ہے۔ محمدیہ تحریک کے ماسوا ایک اور تحریک "ارشاد" کے نام سے جاری ہے جو بٹیویا (BATAWIA) کے عربوں میں بہت مقبول ہے۔ یہ بھی ایک ترقی پسند تحریک ہے۔ اس کے برخلاف مذہبی رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی کوئی منظم تحریک یہاں بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ اس قسم کی بعض چھوٹی چھوٹی تحریکیں ہیں مگر غیر معروف۔ اس کے بعد حاجی سلیم کی تحریک ہے جس کا مقصد مسلمانوں کے افکار کو اتحاد اسلامی اور بین الملیت کی طرف راغب کرنا ہے۔ اس طرح مذہبی قدامت پسندی اور روایت پرستی کے قلعہ پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ یہ سب اُس سمندر کی لہریں ہیں جو محمد عبدہٗ کے دل میں موج زن تھا۔"

الغرض محمد عبدہٗ گزشتہ صدی کے ایک عظیم المرتبت انسان تھے علم و فضل، تقریر و خطابت، حب الوطنی اور مذہبی خدمات جس جس پہلو سے دیکھیے معلوم ہوگا کہ اُن کی زبردست شخصیت اپنے زمانہ پر گہرے نقوش مرتسم کر گئی ہے۔ اور ان خصوصیات کے لحاظ سے ان کا مقابلہ اُن کے زمانہ کی بڑی بڑی ہستیوں سے کیا جا سکتا ہے لیکن جس چیز نے اُن کی عظمت کو چار چاند لگا دیے وہ ان

کا جذبۂ اصلاح تھا اور اُس کا عملی مظاہرہ۔ کیونکہ بقول جرجی زیدان قوموں کی تاریخ میں خواہ وہ کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہو ایسے افراد کم نظر آتے ہیں جن کی سرگرمیوں کا پیمانہ اتنا وسیع ہو جتنا کہ محمد عبدہٗ کے اصلاحی کارناموں کا پیمانہ وسیع تھا۔ جو باغ انھوں نے لگایا تھا اس کو ہرا بھرا اگرچہ وہ خود نہ دیکھ سکے جن سوکھے درختوں کو انھوں نے عمر بھر پانی دیا تھا اُن کی شادابی کے نظارہ سے بھی محروم رہ گئے مگر اُن کے بوئے ہوئے بیج اب ہر طرف پھیلے نظر آتے ہیں اور ان کے لگائے ہوئے درختوں کے پھل اپنی پاکیزگی سے آنکھوں کو طراوت بخش رہے ہیں وہ پھل ہیں لیکن بیداری اور حرکت کی جو لہریں وہ پیدا کر گئے تھے وہ بڑھ بڑھ کر اب جمود و غفلت کی چٹانوں سے ٹکرا رہی ہیں اور اسلامی دنیا کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نیند سے بیدار کر رہی ہیں۔ ان کا ایک ہم عصر لکھتا ہے "اُس دن کے طلوع ہونے سے پہلے ہی وہ دُنیا سے کوچ کر گئے جس کے طلوع کے لئے اُن کی بے تاب فطرت سراپا انتظار تھی"۔

اُس دن کی روشنی ابھی تک نمودار نہیں ہوئی ہے لیکن اُن کی صاف نگاہی اور دور بینی اُس کا جلوہ بہت پہلے دیکھ چکی تھی۔